قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا اناسی واں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

جون 2022ء

’’لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ‘‘ (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پرویز صاحب کے علمی اسلوب تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبالؒ ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

-1 عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

-2 قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

-1 وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

-2 وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال و عمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

-3 وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور

جون 2022ء

جلد 75 | شمارہ نمبر 6

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: جب تک اقتدار قانون کا نہ ہو	ادارہ	4
برقی توانائی کا بحران یا منصوبہ بندی کا فقدان	ابوانیس فاروقی	6
اللہ تعالیٰ کا محیر العقول نظام ربوبیت	ڈاکٹر سید عبدالودود	11
الصلوٰۃ سے زندگی کا ربط	مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی	20
فکرِ پرویز۔۔۔ایک مختصر ترین تاثر	جمیل احمد عدیل	29
درسِ قرآن (سورۃ الرعد، آیات: 3 تا 6)	پرویز علیہ الرحمۃ	36
توبہ کا قرآنی مفہوم (ایصالِ ثواب اور ایصالِ عذاب)	خواجہ ازہر عباس	57

ENGLISH SECTION

The Human Self and Allah By G. A. Parwez (Translated by: Dr. Ejaz Rasool) Episode No.7	61

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions	For International Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672	IBAN:PK36NBPA0465004073177672 Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے، معمارِ جہاں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکنات ِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہانِ آب و گل سے عالم جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

(بانگِ درا۔علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

جب تک اقتدار قانون کا نہ ہو

انسانوں کے مفاد ہمیشہ آپس میں ٹکراتے چلے آ رہے ہیں اور اس ٹکراؤ سے باہمی کشمکش اور تنازعات کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ حکومت کے قیام کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایسے تنازعات وتزاحمات کو حسن وخوبی اور عدل وانصاف سے نپٹایا جائے لیکن عام طور پر دیکھا یہی گیا ہے کہ حکمرانی کی لذت اور اقتدار کا چسکا حکمرانوں کو ایک دوسری راہ پر ڈال دیتا ہے۔ جہاں عدل وانصاف اور فہم وبصیرت کی بجائے اپنی ذمہ داریوں سے بے نیاز ہوکر' وہ حرص اور خودغرضی کا سہارا لیتے ہیں اور ہر قسم کی جواب دہی سے روگردانی اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی مطلق العنانی کا دوسرا نام استبداد ہے۔ فرعون اسی استبداد کا مجسمہ تھا۔ دوسری طرف مذہبی پیشوائیت کا استبداد ہے جس کی گرفت انسانی ذہن پر ہوتی ہے اور ہامانؔ اسی استبداد کا مجسمہ تھا اور پھر سرمایہ داری کا استبداد ہے جو انسان کی اخلاقی جرأتوں کو پامال کرتا ہے۔ قارون اسی استبداد کا مجسمہ تھا۔ قرآن کریم میں داستان بنی اسرائیل میں فرعون' ہامان اور قارون کا ذکر دراصل تاریخ انسانی کے استبداد کی داستان ہے اور تاریخ انسانی میں جہاں جہاں استبداد نظر آئے گا وہ اس زمانے کے فرعونوں' ہامانوں اور قارونوں کی وجہ سے ہوگا اور ان کے باہمی گٹھ جوڑ سے ہوگا۔

استبداد میں حکومت یا تو کسی قانون یا رائے عامہ کی پابند نہیں ہوتی یا ایک حد تک پابند تو ہوتی ہے مگر اختیار رکھتی ہے کہ جب چاہے اس پابندی کو دور کر دے۔ جس طرح مطلق العنان بادشاہوں کی حکومتیں مستبد ہوتی ہیں اسی طرح ان بادشاہوں کی حکومتیں بھی مستبد ہوسکتی ہیں جن کے ہاں مجلسِ مشاورت تو موجود ہو مگر وہ خود جواب دہی سے آزاد ہوں۔ اسی طرح وہ حکومتیں بھی مستبد ہوسکتی ہیں جو نمائندہ یا غیر نمائندہ جماعتوں کے ہاتھ میں ہوتی ہیں کیونکہ مشاورت میں چند افراد کی شمولیت استبداد کا سدباب نہیں کرسکتی بلکہ بعض اوقات اس قسم کی حکومتیں شخصی حکومتوں سے بھی زیدہ جابر اور مضر ہوتی ہیں۔ پاکستان کی سابقہ تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ نیز وہ حکومتیں بھی مستبد ہوسکتی ہیں جو عوام کی نمائندہ تو ہوں لیکن ان میں تنفیذی قوتیں قانونی قوتوں کے سامنے جواب دہ نہ ہوں اور جس میں عوام' حکمرانوں کا محاسبہ کرنے کا حق نہ رکھتے

ہوں۔غرضیکہ کوئی حکومت استبداد سے مبرا نہیں ہوسکتی۔ جب تک اقتدار قانون کا نہ ہو اور وہ قانون بھی خالصتہً انسانی ذہن کی پیداوار نہ ہو۔

استبداد کو مٹا کر اس کی جگہ عدل لانے کے لئے پہلے زندگی کی اقدار کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ یہی کلیدی نقطہ ہے۔جیسی اقدار ویسی زندگی۔ اقدار کے بدلنے سے زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے۔ نگاہ کا زاویہ بدلنے سے داخلی انقلاب آتا ہے اور داخلی انقلاب کے بعد خارجی انقلاب کا آنا لازمی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اس انقلاب کو (By Revolution) لائے تھے لیکن فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں نے پھر نگاہ کے زاویے بدل دیئے قرآن کی دی ہوئی روشنی چھپ نہیں سکتی اور اب وہ (By Evolution) اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی نمودار ہوتی چلی جارہی ہے۔ انسانیت اپنے ماحول سے مجبور ہو کر ان مستقل اقدار کی طرف بڑھ رہی ہے جو قرآن نے دی ہیں۔ انسانیت کا زاویہ نگاہ بہرصورت بدل کے رہے گا لیکن اگر کوئی موجودہ قوم یا حکمران یا چیف جسٹس ہی کائناتی قوتوں کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو جائے تو وہ انقلاب آج آسکتا ہے جو دس بیس یا سو سال کے بعد آنے والا ہے۔ آج بھی اگر کوئی مردِ مومن میدان میں آجائے تو اس کی ایک نگاہ سے تقدیریں بدل سکتی ہیں لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ''حکم'' اللہ کے قانون کا ہو جن کے ہاتھ میں اس قانون کا نفاذ ہو وہ اپنی بشریت کے تقاضوں کو قانون کے تقاضوں سے الگ رکھیں اور اپنا معیارِ زندگی ایک عام انسان کے معیارِ زندگی کی سطح پر لے آئیں۔ اس صورت میں پھر وہی عدل و مساوات کا دور واپس آسکتا ہے جو صدرِ اول میں تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ بات انتہائی افسوسناک ہے کہ گزشتہ مالی سال میں پاکستان نے تعلیم اور صحت کی مد میں مختص کی گئی رقوم میں تاریخی کمی کی ہے اور 30 جون 2009ء کو ختم ہونے والے مالی سال میں یہ 1.1 اور 0.3 فیصد رہیں۔ وطن عزیز میں پچھلی کئی دہائیوں سے تعلیم اور صحت کی مد میں اتنے کم تناسب سے رقوم خرچ نہیں کی گئی تھیں 1990ء کی دہائی کو فوجی ڈکٹیٹر پرویز مشرف کے دور میں اسٹیٹ بینک نے بھی معیشت کے لحاظ سے ناکام دہائی قرار دی تھی مگر اس دہائی میں بھی تعلیم کی مد میں 2.3 فیصد اور صحت کی مد میں 0.7 فیصد رقوم خرچ کی گئی تھیں یہ امر یقیناً اس لئے بھی مزید تشویشناک ہے کہ مالی سال 2009ء میں مجموعی ملکی پیداوار کے تناسب سے تعلیم اور صحت کی مد میں پاکستان میں خرچ کی جانے والی یہ رقوم افریقہ کے بہت سے انتہائی غریب ملکوں کے مقابلے میں بھی انتہائی کم ہیں بلکہ حکومت کے شاہانہ اخراجات اور حکمرانوں کے سرکاری خرچ پر ٹھاٹھ باٹھ ان مالدار صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک کے حکمرانوں کے سرکاری اخراجات سے کہیں زیادہ ہیں جن سے ہم امداد اور قرضوں کے طلبگار رہتے ہیں۔ وطن عزیز کی معیشت روبہ زوال ہے اور ملک میں غربت، بے روزگاری تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ یہ امر نہایت افسوس ناک ہے۔

ابوانیس فاروقی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برقی توانائی کا بحران یا منصوبہ بندی کا فقدان

2008ء میں ملک عزیز کے ایک ماہانہ مؤقر جریدے میں اپنے ایک مطبوعہ مضمون بعنوان ''جاگیرداری وسرمایہ داری کی موت وفنا میں ملک عزیز پاکستان کی حیات و بقا'' میں تفصیل سے عرض کیا تھا کہ اس ملک کے مسائل اس وقت تک حل طلب رہیں گے جب تک یہاں جاگیرداری وسرمایہ داری کا عفریت پروان چڑھتا رہے گا۔ تقسیم ہند کے ساتھ ہی اگر زرعی زمینوں کی ایک خاص تناسب سے عادلانہ تقسیم ہوجاتی اور محنت کش کاشتکاروں کے حوالے کردی جاتیں تو کافی حد تک مشکلات پر قابو پایا جاسکتا تھا۔ یہ زمینیں وڈیروں، نوابوں اور خانوں کو انگریز نے کاسہ لیسی اور چاپلوسی کے عوض اس شرط پر عطا کی تھیں کہ وہ اپنے اپنے زیر اثر مفلوک، مجبور اور مقہور لوگوں کو زیر مزارعت وملازمت رکھیں اور محض نانِ جویں پر زندہ رکھ کر استعمار کی غلامی پر آمادہ رکھیں۔ گوروں نے اپنے دور میں ہند کے لوگوں کو ہر ہر انداز میں غلامی کے شکنجے میں کسے رکھا مگر جزائر برطانیہ کی حدود میں اپنے عوام کو جمہوری روح (اگرچہ وہاں بھی ملوکانہ جمہوریت تھی) کے مطابق آسودہ رکھا۔ جاتے جاتے ہند کی تقسیم کے بعد خصوصاً پاکستانی عوام کو اپنی معنوی ذریت کے حوالے کرگیا۔ یہی وجہ ہے یہ بے چارے آج تک اپنے تن سے غلامی کا چولا اتار سکے نہ اس خو سے چھٹکارا پاسکے نتیجہ پاکستان ''مسائلستان'' بن گیا۔ اگر ملک عزیز کے قائداعظم علیہ الرحمہ زندہ رہتے تو شاید بلکہ یقینا کوئی مؤثر لائحہ عمل دے جاتے۔ شومئ قسمت وہ اور ان کے وفاکیش ساتھی ہم سے جلد ہی رخصت ہوگئے ان کے بعد تو یہ قوم ایک لحاظ سے لاوارث ہوگئی اور مسلسل دلدل میں دھنستی چلی گئی پھر

منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

پیچ در پیچ مسائل ومصائب میں الجھے پاکستان اور اس کے بے حال عوام کے ان دنوں سب سے بڑے مسائل روزافزوں مہنگائی اور توانائی (بجلی) کا بحران ہے۔ پیداشدہ مسائل ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر پیوستہ اور جڑے ہوئے ہیں کہ ایک کی وجہ سے دوسرا مسئلہ پیدا ہوتا چلا جارہا ہے یوں سمجھیں مسائل کی ڈور ایسے الجھی ہے کہ اس کے سلجھاؤ کے لئے ڈھونڈو تو سرا نہیں ملتا۔ قرآن مجید کے الفاظ میں یہ سب کچھ اپنے کئے دھرے کا نتیجہ ہے۔ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (النحل:112)۔ جس کی وضاحت ان لفظوں میں ہوئی۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (30:41)۔

خشکی اور تری میں لوگوں کے (اپنے) اعمال (کرتوتوں) کے باعث فساد (ہی فساد) برپا ہوگیا۔

ملک عزیز اپنے جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے خط استواء کے اس مقام پر واقع ہے جہاں کوہ ودمَن اور صحراؤں و دریاؤں کی فراوانی ہے۔ اس پر مستزاد فصول اربعہ کی بے پایاں عنایت ربانی ہے۔ جس ملک کو ایسی فطری خصوصیات (Features) عطا ہوں وہاں کے عوام افلاس زدہ اور مفلوک الحال ہوکر رہ جائیں کیسے باور کرلیا جائے! جب سے یہ معرض وجود میں آیا ہے تب سے ایسے غاصبوں کا تسلط رہا ہے جو استعماروں کا آلہ کار رہے ہیں اور نسل در نسل وہی لوگ گذشتہ باسٹھ سالوں سے سیاہ وسفید کے مالک چلے آرہے ہیں۔ خاندانی وموروثی سیاست کی بدولت ایک ہی مزاج ومعیار کے افراد اس ملک اور عوام کو بار بار دیکھنے اور آزمانے کو ملتے ہیں جن میں ''قومی سوچ'' کا فقدان ہے ایسے فکری اپاہجوں سے اچھائی کی توقع آخر کیونکر ممکن ہے۔ انفرادی مفادات کی ''ہوشربا ہوس'' نے سیاسی جماعتوں اور ان کے زعماء کو اجتماعی مفادات ومقاصد کے لئے کبھی آمادہ ہونے ہی نہیں دیا۔ اس ملک میں اس قدر متبادل اور گوناگوں وسائل ہیں جنہیں استعمال میں لاکر ہم برقی توانائی میں نہ صرف خودکفیل ہوسکتے ہیں بلکہ قرب وجوار میں ضرورت مندوں کو بھی توانائی مہیا کرسکتے ہیں۔ دنیا میں پاکستان ایسے جغرافیائی محل وقوع رکھنے والے ہر ملک کے پاس بجلی پیدا کرنے کے متنوع ذرائع ہیں: آبی وسائل' یک سمتی ساحلی ہوائیں' وافر آفتابی تمازت وحرارت' معدنی ذخائر اور جوہری توانائی وغیرہ ان تمام وسائل سے ہمارا ملک مالا مال ہے۔

شمالی علاقوں میں پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جہاں جنگلات کی کثرت کے باعث جنوبی علاقوں میں واقع سمندروں کی سطح سے اٹھنے والے پانی بھرے بادل تیز ہواؤں کے ذریعے یہاں پہنچ کر خوب برستے ہیں۔ وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ (30:22)۔ معاً یہاں اکثر بالائی سطح پر جب درجہ حرارت نقطہ انجماد پر پہنچتا ہے تو برفباری کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ (24:43)۔ پہاڑ برف پوش ہوجاتے ہیں اس طرح یہاں اس شکل میں بے پناہ پانی ذخیرہ ہوجاتا ہے جو ہزار بلکہ لاکھ انسانی کاوشوں سے ممکن نہیں۔ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ (15:22)۔ جو بعد ازاں ایک خاص درجہ حرارت پر پگھل کر چھوٹے چھوٹے ندی نالوں (Catchment areas) کے ذریعے ایک مقام پر اکٹھا ہوجاتا ہے اور دریا کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا (13:17)۔ اب چاہے اس سے فائدہ اٹھائے بغیر سمندروں میں دوبارہ بھیج دیا جائے یا انہیں ذخیرہ کرکے ایک خاص سطح تک (ہیڈورکس کے ذریعے) بلند کرنے کے بعد ٹربائینیں (Turbines) چلا کر بجلی پیدا کرلی جائے۔ ماضی میں چند ایک بڑے ہیڈورکس تعمیر کرکے ہم نے پن بجلی پیدا کی ان میں اکثر منصوبے ایوبی دور میں مکمل ہوئے جو اپنی مدت پوری کرچکے اس کے ساتھ ہی مزید ڈیم (Dams) بنانے کی ضرورت تھی جن میں کالاباغ ڈیم بھی شامل تھا جو اپنے فطری ماحول اور محل وقوع کے حوالے سے انتہائی محفوظ' کم خرچ اور ملکی ضروریات پورا کرنے کی کامل استعداد کے قابل تھا مگر ابھی تک سیاست کاروں کی آویزش کا شکار یہ منصوبہ تشنہ تعمیر ہے۔ ایسا ممکن نہ تھا تو بڑے بڑے ڈیموں کی تعمیر کے بجائے اگر ہم نے گذشتہ باسٹھ سالوں میں چھوٹے چھوٹے منصوبوں پر مسلسل کام جاری رکھا ہوتا تو مقامی ضرورتوں کو پورا کرکے موجودہ ناگفتہ

یہ صورتحال سے یقینا بچا جا سکتا تھا بالخصوص بڑی بڑی نہروں پر پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ زیریں علاقوں تک چھوٹے چھوٹے ہیڈورکس تعمیر کر کے مقامی ضروریات پورا کرنے کے لئے بجلی پیدا کی جاسکتی تھی۔

بلوچستان میں اپنے قیام کے دوران میں نے دیکھا کہ اکثر مقامات پر دو پہاڑوں کے درمیان کم فاصلہ ہونے کی بنیاد پر بند (ہیڈ ورکس) تعمیر کئے جا سکتے ہیں ان پہاڑوں کے عقب میں بے پناہ جگہ اور مناسب ڈھلوان ہونے کی وجہ سے کافی مقدار میں پانی ذخیرہ کر کے چھوٹے چھوٹے پن بجلی گھر تعمیر کرنا آسان ہے۔ بالائی علاقوں سے زیریں مقامات پر پہنچ کر پانی جب رودکوہیوں سے گذرتا ہے تو اس قدر اس کا دباؤ ہوتا ہے کہ اکثر اوقات سواریوں سے بھری گاڑیوں یا سامان سے لدے ٹرکوں کا اسے عبور کرنا ناممکن ہوجاتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان علاقوں میں پانی کے نشیب کی طرف بہاؤ میں فطرتاً شدید دباؤ ہوتا ہے جو چھوٹے جنریٹر چلانے کے لئے خاطر خواہ فائدہ مند ہے۔ پانی کی ان قدرتی گذرگاہوں پر دیواریں (Brakers) کھڑی کر کے نشیب میں دور تک پن بجلی کے چھوٹے یونٹ لگا کر اس علاقے کے مکینوں کو بجلی مہیا کی جاسکتی ہے اور زراعت کے لئے پانی استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ جزووقتی منصوبے ہو سکتے ہیں جن کا انحصار محض بارشوں پر ہے۔ 2001ء میں اس وقت کے ایک مینگل گورنر نے ایک دو مقامات پر اس قسم کے چھوٹے ڈیموں کا افتتاح کیا تھا مگر صرف پانی ذخیرہ کرنے کے لئے۔ جب کہ شاید ابھی تک بجلی کی جنریشن کے لئے کوئی کام نہیں ہوا۔

فورٹ منرو کے پہاڑوں سے اترتے ہی رَکھنی سے آگے پہاڑوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے جن کے درمیان گذرگاہیں یا شاہراہیں بظاہر یکساں سطح کی لگتی ہیں مگر کسی بالا مقام سے نظارہ کیا جائے تو ان میں خاصا ڈھلوان ہے جہاں پانی ذخیرہ کر کے دوہرا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے ایک تو جب پہاڑوں سے پانی دامن میں آتا ہے تو پیداواری صلاحیت کی حامل زرخیز مٹی ساتھ لاتا ہے جس کے قدرتی اجزاء کسی قسم کی کھاد یا فرٹیلائزر سے قطعاً بے نیاز ہوتے ہیں۔ دوسرے اسی پانی کو ذخیرہ کر کے بجلی پیدا کر کے مقامی ضروریات کو پورا کیا جاسکتا ہے۔ بھارت سے دریائی پانی کی تقسیم پر ہم نے ہر سطح پر خوب دہائی دی مگر اپنے آبی وسائل کو محفوظ کرنے میں مجرمانہ غفلت سے کام لیتے رہے۔ حال ہی میں ہماری منتظمہ کی حکمت عملی کا بھرم اس وقت کھل گیا جب ہنزہ میں عطاء آباد کے مقام پر ایک ہنگامی اور پرفتن جھیل وجود میں آگئی جس سے بے تحاشا عوامی و ریاستی نقصان ہوا پانی کے اتنے بڑے ذخیرے کو ضبط و محفوظ کرنے میں ہم جس کسمپرسی کا شکار رہے وہ سب کے سامنے ہے۔ نیتوں میں فتور نہ ہو تو اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے قدرت کے عطا کردہ شاندار وسائل سے بھرپور استفادہ ممکن ہے۔ ساحل سمندر سے چلنے والی ہوائیں عموماً یک سمتی ہوتی ہیں مثلاً جن لوگوں نے کراچی سے حیدرآباد اور آگے اندرون سندھ تک سفر کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ ہوائیں یک سمتی ہونے کے ساتھ اس قدر تیز ہوتی ہیں کہ ہاتھ سے نکلتا رومال یا کوئی چیز آسانی سے قابو نہیں آتی۔ حیدرآباد اور آس پاس کے علاقوں میں لوگوں نے مدتوں سے اپنے گھروں کی تعمیر بھی اس انداز میں کر رکھی ہے کہ آسانی سے ان کے گھروں میں ان ہواؤں کا گذر ہو سکے۔ خاص طور پر گھروں کی بالائی چھت سے لے کر

زیریں کمرے تک ایسے چمنی نما روشندان (بطور ایئر کنڈیشنر) بنا رکھے ہیں کہ تازہ ہوا ان سے گذر کر آخر تک پہنچ جائے اور ضرورت کے مطابق جس کمرے میں ضرورت ہو تو اس خول دار ستون سے مطلوبہ کمرے میں سوراخ کھول لیا جائے۔ کراچی اور حیدرآباد کے درمیان اس قدر وسیع علاقہ خالی پڑا ہے جہاں ان یک سمتی ساحلی ہواؤں سے پَوَن چکیاں Wind) (Mills چلا دی جائیں تو پورا ملک نہ سہی ان علاقوں میں جہاں ان ہواؤں کا گذر ہے جنریٹر چلا کر وہاں کے باسیوں کو وسیع پیمانے پر ارزاں بجلی مہیا کی جاسکتی ہے۔ ہمارے زیادہ تر سمندری ساحل سندھ اور بلوچستان میں واقع ہیں۔ ان ہواؤں کی رسائی (Approach) ساحلوں سے بہت دور آبادیوں تک ہے۔ ایک جائزے کے مطابق پاکستان میں پَوَن چکیوں سے پچاس ہزار میگاواٹ بجلی پیدا کی جاسکتی ہے مگر اس وقت صرف سو میگاواٹ بجلی پیدا کی جا رہی ہے۔ چین میں پون چکیوں سے 2500 جب کہ بھارت میں 1800 میگاواٹ بجلی پیدا کی جا رہی ہے۔

پنجاب، سندھ اور بلوچستان کا کافی علاقہ طلوع آفتاب کے بعد دھیرے دھیرے سورج کے سامنے آجاتا ہے اور کافی دیر تک تمازت یا حرات برقرار رہتی ہے۔ اگر بڑے پیمانے پر کوئی منصوبہ قابل عمل نہ ہو تو شمسی توانائی کے استعمال سے برقی توانائی کا حصول چھوٹے یونٹوں کے ذریعے ممکن بنایا جاسکتا ہے۔ یہ چھوٹے یونٹ گھریلو استعمال کے لئے آسان اقساط پر مذکورہ علاقوں کے مکینوں کو مہیا کئے جائیں تو آبی وسائل سے حاصل ہونے والی برقی توانائی کو مشکل حالات میں محفوظ کیا جاسکتا ہے تاکہ بوقت ضرورت صنعت و زراعت کے لئے استعمال میں لائی جاسکے۔ اس طرح عوامی بے چینی کے ساتھ حکومتی اضطراب بھی کم ہوسکتا ہے۔ جب سے ملک عزیز معرض وجود میں آیا ہے شمسی توانائی کے استعمال کے لئے کسی بڑے منصوبے پر ہنوز عمل درآمد نہیں ہوسکا۔ البتہ ملک کے مختلف شہروں میں اِکا دُکا چھوٹے یونٹ کام کرتے دکھائی دیتے ہیں بعض کاشتکاروں نے اپنے وسائل استعمال میں لا کر اپنی مدد آپ کے تحت زراعت کے لئے شمسی توانائی کے ذریعے ضرورت کے وقت ٹیوب ویل چلا رکھے ہیں۔ انفرادی سطح پر اگرچہ ایسے یونٹ مہنگے پڑتے ہیں مگر مشکل ترین حالات میں یہ نعمت سے کم نہیں کہ زرعی محنت کو اکارت جانے سے بچایا جاسکتا ہے۔ حال ہی میں سولر واٹر پمپ کا اسلام آباد میں تجربہ ہوا ہے جسے عظیم پڑوسی ملک چین سے درآمد کیا گیا ہے اس سسٹم کے تحت چلنے والا پمپ کم از کم پچیس سال تک کارآمد ہے۔

اسی طرح بلوچستان میں اکثر اور سندھ میں بعض مقامات پر کوئلے کے وسیع ذخائر موجود ہیں۔ تھرکول کے بارے میں ہمارے ملک کے ایک معروف سائنسدان نے حال ہی میں انتہائی اہم انکشاف کیا ہے کہ جدید بنیادوں پر کوئلے (کول) کو استعمال کر کے جہاں ٹرانسپورٹ کے اخراجات بچائے جاسکتے ہیں۔ وہاں یہ ذخائر آئندہ آٹھ سو سال تک بجلی پیدا کرنے کے لئے کافی ہیں۔ مگر وائے افسوس دیگر کئی معدنی وسائل کی طرح اس اہم خزانے سے ابھی تک استفادہ نہیں ہوسکا۔ حالانکہ ان کو دریافت کئے سولہ سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے (جس کی مقدار 200 ارب ٹن بتائی جاتی ہے)۔ خلاق عالم کی اس بے پناہ عطا کے باوجود بے حال عوام کسمپرسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں جن کے ہاتھوں میں کشکول گداگری تھما دیا گیا ہے۔ جب

قوم کے راہنما گداگری میں دی گئی وہ رقم جو بمع سود قابل واپسی ہے، پر باچھیں کھلا کر حمیت ناآشنا کامیابی پر اتراتے پھریں وہ بھلا قوم کے اجتماعی مفاد اور آئندہ نسل کی بقاء کا کیا سوچ سکتے ہیں ہر لحاظ سے ''ڈنگ ٹپاؤ'' کام کر کے اپنی تجوریاں بھرنے میں مصروف ہیں۔ بعض قومی درد اور اجتماعی سوچ کے حامل افراد نے ''جوہری توانائی'' کے حصول میں شبانہ روز کاوشیں کی ہیں اس سے بھی ہم نے حسب حال فائدہ نہیں اٹھایا ''ایٹمی طاقت'' کا دعویٰ رکھنے کے باوجود ہم اپنا بھرم نہ رکھ سکے۔ پورا ملک تاریکیوں میں ڈوب چکا ہے۔ دیا جلانے کے لئے مٹی کا تیل بھی بجلی کے یونٹ سے زیادہ مہنگا کر دیا گیا ہے۔ صرف رینٹل پاور پلانٹس کی (ذاتی مفادات کے تحت) پذیرائی کے لئے ملک وقوم کو اس جانکاہ صورت حال میں قصداً دھکیل دیا گیا ہے ورنہ ملک عزیز پاکستان میں برقی توانائی کے حصول کے لئے قدرت کے انمول اور وافر وسائل کی کمی نہیں۔ ان وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چھوٹے منصوبوں پر فوری عملدرآمد کر کے قوم کو اندھیروں سے نکالا جا سکتا ہے۔

اس وقت ترقی یافتہ ممالک بالخصوص جاپان اور چین کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ اول الذکر کے یہاں معدنی وسائل نہ ہونے کے برابر ہیں اس سے بڑھ کر انیسویں صدی کے وسط تک جاگیردار سفاکوں کے چنگل میں رہا پھر ناگاساکی اور ہیروشما کا ہولناک حادثہ اس پر سوا ان تمام محرومیوں اور بربادیوں کے باوجود اس قوم نے عزم بالجزم کے ساتھ انقلاب کی جب ٹھان لی تو ہر ممکن طریقے سے وسائل خرید کر اپنے ملک کو صنعتی انقلاب کی اس سطح پر لا کھڑا کیا جو نہ صرف لائق تعریف بلکہ قابل رشک اور تقلید بھی ہے۔ اس انقلاب کے آغاز ہی میں یورپ کے مقابل اپنی مصنوعات کو دنیا میں متعارف کروا دیا۔ اسی طرح چین اپنے کوہساروں اور میدانوں میں چھوٹے چھوٹے بجلی گھر تعمیر کر کے مقامی آبادیوں کو آسودہ کرنے کے بعد قومی سطح پر صنعتی ضروریات کے لئے برقی توانائی بلاقیمت مہیا کر رہا ہے۔ کوئی ہے اس میدان میں اس کے مقابل!!! محفوظ اثاثوں کے حوالے سے دنیا کے پہلے تین ممالک میں شامل ہو چکا ہے اور دنیا کی عالمی طاقت اسی کی مقروض ہے۔ کل جو اسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا آج مالی استمداد کے لئے اس کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہے۔ جی ہاں۔ یہ وہی چین ہے جو ہم سے ایک سال بعد آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہوا۔ نشہ بازوں کی آماجگاہ تھا۔ غربت و افلاس کی اس سطح پر تھا کہ روٹی کے چند نوالوں کے لئے ڈیڑھ لاکھ چینیوں کو بطور قلی کیوبا بھیجنا پڑا اور لگ بھگ اتنی ہی بڑی تعداد کو 1860ء میں پیرو (Paro) کے اندر غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور آج وہی چین ایک عظیم الشان طاقت کے طور پر خریطہ عالم پر اس شان سے ابھرا ہے کہ جس کی نظیر شاید و باید دنیا کی کون سی منڈی ہے جہاں "Made in China" کے جلی عنوان سے اس کی مصنوعات و منتوجات موجود نہ ہوں۔ چھا گیا ہے صرف اس لئے کہ ''قومی جذبے'' کے ساتھ میدان عمل میں اترا اور اپنے بے عمل و بدکردار رجعت پسندوں سے خلاصی پا کر نئی نسل کو جدت یعنی جدید علوم وفنون پڑھنے اور سیکھنے کی راہ پر ڈال دیا جس نے چھوٹے بڑے منصوبوں پر اپنے وسائل سے عملدرآمد کر کے بڑی طاقتوں کو لرزہ براندام کر دیا ہے۔ بالخصوص شہنشاہ عالم امریکہ کو جس کے ہم من حیث القوم اپنی متوارث قیادت کے طفیل نسل درنسل غلام چلے آ رہے ہیں۔

فَاعْتَبِرُوْا يَآأُولِي الْاَبْصَارِ (59:2)

ڈاکٹر سیّد عبدالودود

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ تعالیٰ کا محیر العقول نظامِ ربُوبیت

محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب نے قرآنِ کریم کی بلند پایہ علمی اصطلاحات کا مفہوم، سائنٹفک تحقیقات کی روشنی میں واضح کرنے کا جو انداز اختیار فرمایا ہے وہ انتہائی دلچسپ بھی ہے اور معلومات افزا بھی۔ اسی بناء پر قارئین نے اس سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ زیرِ نظر قسط میں، انہوں نے اللہ تعالیٰ کے محیر العقول نظامِ ربوبیت کے بعض دقیق گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے۔ (ادارہ)

میں نے اپنے سابقہ مقالہ میں (جو طلوعِ اسلام بابت مارچ 1980ء میں شائع ہوا ہے) آیات (41:9-12) کے ان گوشوں کے متعلق گفتگو کی تھی جن کا تعلق تخلیق ارض وسمٰوٰت سے تھا۔ ان آیات میں کچھ اہم نکات نظامِ ربوبیت سے بھی متعلق ہیں۔ اب میں ان کے متعلق اپنی تحقیق کے نتائج پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔

وَبٰرَكَ فِيۡهَا وَقَدَّرَ فِيۡهَاۤ اَقۡوَاتَهَا (41:10):

جیسا کہ میں اپنے سابقہ مقالہ میں بیان کر چکا ہوں، یہ الفاظ زمین کے بے جان مادہ میں زندگی کی نمود سے متعلق ہیں ’’وَبٰرَكَ‘‘ کا لفظ بڑا جامع ہے۔

اس کے معنی ایسے ثبات کے ہیں جس کے ساتھ نمو بھی ہو۔ یعنی ایک چیز اپنے مقام پر مستحکم بھی ہو اور ساتھ ہی بڑھ بھی رہی ہو، اور اس کی مضمر صلاحیتیں نمودار ہو کر سامنے آ رہی ہوں۔ چنانچہ لفظ ’’برکۃ‘‘ میں ثبات، استحکام، کثرت، نشوونما اور ظہور ونمود کے تمام پہلو آجاتے ہیں۔ (لغات القرآن از پرویزؔ)

سائنس آف بائیالوجی (علم الحیات) کی ایک اصطلاح ہے (Self Perpetuation) جس کے معنی وہی ہیں جو لفظ ’’برکت‘‘ کے ہیں۔ یہ سوال ابھر کر سامنے آجاتا ہے کہ زندہ اشیاء میں وہ کیا قدرِ مشترک ہے جس سے پہچانا جا سکے کہ یہ اشیاء زندہ ہیں۔ جہاں تک کیمیائی عناصر کا تعلق ہے، وہ زندہ اور بے جان اشیاء میں ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ زندہ شے، چاہے ایک جرثومہ (Cell) پر مشتمل ہو چاہے اربوں (Cells) پر، ان سب کے افعال (Activities) ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ یعنی:

(1) NUTRITION: اپنے ماحول سے خام مادے کا حصول۔

(2) RESPIRATION: اپنے ماحول سے انرجی (توانائی) کا حصول۔

(3)Self-Repair: خام مادے (غذا) اور انرجی کے ذریعے اپنے جسم کے اجزا نئے سرے سے تیار کرنا۔ ٹوٹے پھوٹے کی مرمت کرتے جانا۔

(4)GROWTH: نئے تیار کردہ اجزاء سے جسم کا بڑھنا۔

(5)DEVELOPMENT: نئے اجزاء کے ذریعے نئی خصوصیات کا پیدا ہونا۔

(6)ADAPTATION: یعنی بدلے ہوئے ماحول میں اپنے جسم میں تبدیلی پیدا کر کے اپنے بقاء کی خاطر نئے ماحول کا مقابلہ کرنا۔

ان افعال کو دو گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(1)METABOLISM اور (2)SELF-PERPETUATION، Metabolism میں خام مادہ کا حصول، انرجی کا حصول، اور جسم کے اجزاء کی تعمیر شامل ہیں۔ اس میں سے کچھ انرجی جسمانی ساخت کی تعمیر میں خرچ ہوتی ہے اور باقی (Self-Perpetuation) کے کام آتی ہے۔

اب آپ غور کیجئے کہ اگر ایک مشین کو خام مال اور انرجی (پٹرول یا کوئلہ یا بجلی) مہیا کر دی جائے تو مشین بھی اپنے پرزے خود تیار کر سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ صرف (Metabolism) ایسا فعل نہیں جس سے زندہ چیز، بے جان چیز سے متمیز ہوتی ہے۔ دراصل امتیازی فعل (Self-Perpetuation) ہے۔

Self-Perpetuation پھر تین افعال پر مشتمل ہے:

(1)Steady State Control، (2)Reproduction تولید اور (3)Adaptation بدلے ہوئے ماحول کے مطابق بدلنا۔ (Steady State Control) ایک جاندار کے اندر بے شمار پیچیدہ کنٹرول سسٹم ہوتے ہیں جن کے ذریعے وہ اپنے داخلی اور خارجی ماحول سے آگاہ رہتا ہے۔ اسے یہ آگہی محرکات (Stimuli) کے ذریعے حاصل ہوتی ہے جن کا ردِعمل (Preservation) یعنی تحفظ خویش کی شکل میں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے جسم میں جب غذا ختم ہو جاتی ہے، تو بھوک لگتی ہے، پانی ختم ہو جائے تو پیاس لگتی ہے۔ جس کام کے کرنے میں زیادہ قوت صرف ہو اس سے آکسیجن ختم ہو جاتی ہے جسے حاصل کرنے کے لئے سانس تیز ہو جاتی ہے۔ جسم، خوراک، پانی، آکسیجن اسی قدر حاصل کرتا ہے جس قدر اسے ضرورت ہوتی ہے۔ ضرورت پوری ہونے کے بعد بھوک پیاس بھی ختم ہو جاتی ہے اور تنفس بھی معمول پر آ جاتا ہے۔ (اس ''بقدرِ ضرورت'' حصول کو پیشِ نظر رکھئے تا کہ آگے چل کر لفظ ''اقواۃ'' کے معنی واضح ہو جائیں)

REPRODUCTION۔ (Steady State Control) کے باوجود ہر جاندار کی طبعی زندگی کی ایک حد ہے، کیونکہ (Control Systems) میں (Wear and Tear) بوسیدگی اور فرسودگی کا عمل ہر وقت جاری رہتا ہے۔ اگر چند ایک کنٹرول سسٹمز خراب ہو جائیں، تو جاندار بیمار ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں باقی سسٹمز (Self repair)

کا کام دیتے ہیں۔ اگر سارے کے سارے کنٹرول سسٹمز خراب ہوجائیں تو اس کی موت واقع ہوجاتی ہے۔ یہاں پھر ایک مشین اور زندہ شے میں مماثلت پائی جاتی ہے، جس طرح مشین ایک عرصہ کے بعد بیکار ہوجاتی ہے۔ مگر جاندار کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے جو مشین کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ یہ ہے (Reproduction) یا تولید کا عمل۔ گویا تولید کا عمل ایک لحاظ سے موت کا بدل ہے۔ اس کے ذریعے زندگی آئندہ نسلوں میں جاری رہتی ہے۔ یعنی فردِ متعلقہ کی طبیعی زندگی نہیں بلکہ محض زندگی۔۔۔ (LIFE-ADAPTATION) یہ زندگی کے ثبات اور استحکام کو قائم رکھنے کی آخری تدبیر ہے۔ یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ماحول میں جو طویل المیعاد (LONG-RANGE) تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، (STEADY STATE CONTROL) اور عملِ تولید، دونوں مل کر بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مدت مدید کے بعد آب وہوا بدل سکتی ہے۔ زمین کی خشکی تری میں اور تری خشکی میں تبدیل ہوسکتی ہے۔ جنگل کی جگہ ریگستان اور ریگستان کی جگہ جنگل بن سکتے ہیں۔ فلہٰذا، ایک طویل مدت کے بعد نئی نسلیں بدلے ہوئے ماحول میں زندہ نہیں رہ سکتیں، تآنکہ ان کے جسم میں ایسی تبدیلی نہ آجائے جو بدلے ہوئے ماحول کا مقابلہ کر سکے۔ یہ تبدیلی (SEX) نر و مادہ کے اختلاط اور (MUTATION) یکسر نئے اجزاء کے معرضِ وجود میں آنے سے پیدا ہوتی ہے۔ (تفصیل میری کتاب میں ملے گی [1])

یہ ہے (Self Perpetuation) کا وہ عمل جسے قرآن نے ایک لفظ (برکۃ) میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ یہ ہے قرآن کا اندازِ بیان اور اس کا اعجاز!

(2) وَقَدَّرَ فِيهَآ أَقْوَاتَهَا (41:10):

اقوات، القوت کی جمع ہے۔ لغات القرآن میں اس کے معانی دیئے گئے ہیں۔ ''اتنی خوراک جس سے انسان زندہ رہ سکے'' (یعنی خوراک کا حصول بقدرِ ضرورت اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) میں اس مقالہ میں لفظ خوراک یا غذا ہی استعمال کروں گا کیونکہ یہ عام فہم ہے ورنہ (BIOLOGY) میں (FOOD) اور (NUTRITION) دو الگ الگ اصطلاحات ہیں۔ (NUTRITION) ماحول سے براہِ راست حاصل کی جاتی ہے، جس طرح پودا کرتا ہے لیکن حیوانات اپنی خوراک ماحول سے خام مادہ لے کر تیار نہیں کرتے۔ بعض حیوان پودوں کی شکل میں بنی بنائی خوراک کھاتے ہیں۔ انسان پودے اور حیوان دونوں کو کھاتا ہے۔ پودے اور حیوان کا یہ فرق اسی وقت پیدا ہو گیا تھا جب زندگی ہنوز ایک ہی (Cell) پر مشتمل تھی۔ جو (Cells) اپنی خوراک خود خام مادہ سے تیار کرتے تھے ان کی نسلیں آگے جا کر پودے بن گئیں اور جن (Cell) کی خوراک کا انحصار دوسرے (Cells) پر تھا ان کی آئندہ نسلیں حیوانات بن گئیں۔

زمین پر خوراک کے حصول کے طریق مختلف زمانوں اور مختلف ماحول میں بدلتے گئے۔ اللہ کی ربوبیت کی یہ داستاں بڑی طویل ہے لیکن میں اسے مختصراً بیان کرتا ہوں۔

(1)Phenomena of Nature and the Quran

زمین کے سورج سے الگ ہونے کے (3000) ملین سال بعد، اوّلیں جرثوماتِ حیات (Life Cells) پیدا ہوئے۔ جب یہ ایک مرتبہ معرضِ وجود میں آ گئے تو ان کی تعداد میں بڑی تیزی کے ساتھ اضافہ ہونے لگا تا آنکہ ایک وقت ایسا آیا کہ سمندروں کے پانی میں خام مادہ، جو ان کی خوراک تھی، میں کمی واقع ہوگئی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے (Cells) نے ایک دوسرے کو کھانا شروع کر دیا۔ اور یہ تین طریقوں سے ہوا۔ (1) بعض چھوٹے (Cells) بڑے (Cells) کے جسم میں داخل ہو کر ان کی خوراک کھاتے رہے۔ اس عمل کا نام (Parasitism) ہے۔ بعض (Cells) نے دوسرے مردہ (Cells) کو کھانا شروع کر دیا۔ اسے (Saprotrophism) کہتے ہیں اور بعض بڑے (Cells) نے چھوٹے (Cells) کو کھانا شروع کر دیا اس کا نام (Holotrophism) ہے۔ لیکن ان تینوں طریقوں سے زمین کے خوراک کے مجموعی ذخائر میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ اگر یہی عمل جاری رہتا تو کچھ عرصہ کے بعد زمین پر سے زندگی ناپید ہو جاتی۔ لیکن رب العالمین کو یہ منظور نہ تھا کیونکہ زندگی نے ابھی بے شمار منزلیں طے کرتے ہوئے آگے بڑھنا تھا۔ چنانچہ زمین پر خوراک کے نئے (Sources) کے ارتقاء کا عمل شروع ہو گیا۔ زمین کے اولین (Life Cells) کی خوراک، میتھین، ایمونیا اور پانی کے مرکب سے بنی تھی اور اس کی تیاری کے لئے انرجی سورج کی شعاعوں سے اور بادلوں کی بجلی سے لی گئی تھی۔ لیکن بعد ازاں جب فضا کے بخارات ٹھنڈے ہو کر پانی بن گئے اور ہزاروں برس تک مسلسل بارش سے سمندروں کے پانی میں تبدیل ہو گئے تو بادلوں کی بجلی آہستہ آہستہ ناپید یا کم ہوگئی۔ دوسرے طرف زمین کے (Atmosphere) میں کاربن ڈائی اوکسائڈ کی تہہ جم گئی جو اس (High Energy Radiation) کے راستے میں جو سورج سے زمین پر آتی تھی روک بن گئی۔ ظاہر ہے جب تک نئی انرجی دستیاب نہ ہو نئی خوراک تیار نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ بعض Cells نے گندھک، لوہا اور نائٹروجن کے مرکبات سے انرجی حاصل کرنا شروع کر دی۔ اس عمل کو Chemosynthesis کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ سورج کی روشنی کی شعاعوں سے انرجی حاصل کرنے کا ایک پیچیدہ لیکن دلچسپ ذریعہ پیدا ہو گیا۔ یعنی ایک مرکب وجود میں آیا جسے Chlorophyll کہتے ہیں اور جو آج بھی روشنی کی شعاعوں سے انرجی حاصل کر کے پودے کی ہوا سے حاصل کردہ کاربن ڈائی اوکسائڈ اور زمین سے حاصل کردہ پانی اور نمکیات کو کاربوہائیڈریٹ میں تبدیل کرتا ہے جو پودوں کی خوراک ہے اور پودوں کو حیوان کھاتے ہیں اور پھر حیوان کو حیوان کھاتے ہیں۔ اور انسان پودوں اور حیوانات دونوں کو کھاتا ہے (Chlorophyll) کے ذریعے خوراک تیار کرنے کے طریق کو (Photosynthesis) کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے نظامِ ربوبیت کے چند اور کرشمے ملاحظہ فرمائیے۔ مچھلی اور مینڈک پانی میں انڈے دیتے ہیں۔ ان انڈوں کے اندر خوراک کا کوئی ذخیرہ نہیں ہوتا جس سے جنین کی نشوونما ہو سکے۔ ان کی خوراک پانی کے اندر موجود ہوتی ہے جہاں سے وہ اسے براہِ راست حاصل کرتے ہیں۔ اسی لئے ان انڈوں کے گرد خول نہیں ہوتا کیونکہ انڈے کے اندر کا پانی خشک ہونے کا احتمال نہیں ہوتا۔ اس سے اوپر کی سطح کے جانور (Reptiles) رینگنے والے جانور اور پرندے ہیں۔ ان کے انڈے چونکہ

خشکی پر ہوتے ہیں اس لئے ان کے سوکھ جانے کا احتمال ہوتا ہے۔ بنا بریں ان کے اوپر خول بن گیا۔ خول والے انڈے چونکہ اپنے ماحول سے براہِ راست خوراک حاصل نہیں کر سکتے اس لئے ان کے اندر جنین کی پرورش کے لئے غذا کا بڑا ذخیرہ موجود ہوتا ہے، جس طرح مرغی اور بطخ کے اندے کی زردی اور سفیدی ہے۔ علاوہ ازیں خود انڈے کا خول بھی اللہ کے نظامِ ربوبیت کا عجیب کرشمہ ہے۔ خول کے اندر سے انڈے کا پانی بخارات بن کر باہر نہیں آ سکتا لیکن خول میں مسام ہوتے ہیں جن کے ذریعے باہر سے آکسیجن خون کے اندر داخل ہوسکتی ہے۔ اب اس سے اوپر کے درجہ کی طرف آیئے۔ دودھ دینے والے جانوروں کا انڈا چونکہ رحمِ مادر میں نشوونما پاتا ہے اس لئے اس کے گرد خول کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور اس انڈے کے اندر جنین کی پرورش کے لئے خوراک بھی نہایت قلیل مقدار میں ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر انسان کے (OVUM) کو لیجئے۔ اس کی (FERTILISATION) یعنی مرد کے (Cell) سے اختلاط (Fallopian Tube) کے اندر ہوتی ہے۔ ٹیوب سے رحم تک پہنچنے کے لئے ایک ہفتہ درکار ہوتا ہے۔ جب یہ رحم مادر کے اندر اپنی جگہ پکڑ لیتا ہے تو جنین کی خوراک براہِ راست ماں کے خون سے ملنی شروع ہوجاتی ہے۔ چنانچہ انسانی (OVUM) کے اندر خوراک کی مقدار اتنی ہی ہوتی ہے، جو چند دنوں کے لئے کافی ہو۔ جب جنین رحم مادر کے اندر اپنے قیام کی مدت پوری کر لیتا ہے تو ماں کا دودھ تیار ملتا ہے۔

اسی طرح پانی کی طرف دیکھئے۔ سمندر کے پانی میں نمکیات اتنے زیادہ ہوتے ہیں۔ (ملحٌ اجاج) کہ اسے زبان پر رکھنا بھی محال ہوتا ہے۔ سورج کی گرمی سے یہ پانی بخارات بن کر ہوا میں اڑ جاتے ہیں۔ ہوا میں ٹھنڈے ہو کر بخارات جم جاتے ہیں۔ پھر بارش برستی ہے اور صاف سُتھرا میٹھا پانی (عذبٌ فرات) جانداروں کو پینے کے لئے ملتا ہے۔ یہ پانی ندیوں اور دریاؤں میں زمین کے ساتھ رگڑ کھاتا ہوا نشیب کی طرف آتا ہے تو اس میں نمکیات پھر اکٹھے ہوجاتے ہیں اور یوں پانی ''عذب فرات'' سے پھر ''ملح اجاج'' بن جاتا ہے۔ اگر سورج کی حرارت سے پانی کے اوپر چڑھنے کا عمل اور Gravity کے ذریعے پانی کے نیچے اترنے کا عمل جاری نہ رہے تو زمین کا سارا پانی ''ملحٌ اجاج'' بن جائے اور زمین پر سے زندگی ناپید ہوجائے۔ اسی لئے رب العالمین نے فرمایا:

اَفَرَءَيۡتُمُ الۡمَآءَ الَّذِىۡ تَشۡرَبُوۡنَؕ‏ ﴿۶۸﴾ ءَاَنۡتُمۡ اَنۡزَلۡتُمُوۡهُ مِنَ الۡمُزۡنِ اَمۡ نَحۡنُ الۡمُنۡزِلُوۡنَ‏ ﴿۶۹﴾ لَوۡ نَشَآءُ جَعَلۡنٰهُ اُجَاجًا فَلَوۡلَا تَشۡكُرُوۡنَ‏ ﴿۷۰﴾ (56:68-70)

''پھر اس پر غور کرو کہ جس پانی کو تم پیتے ہو اس کو بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہمارا قانونِ ربوبیت برساتا ہے۔ اگر ہم اسے کھاری بنا دیتے تو تم کیا کرتے! تو پھر تم شکر گزار کیوں نہیں ہوتے؟

وَقَدَّرَ فِيۡهَاۤ اَقۡوَاتَهَا (41:10) کی داستان طویل ہے۔ میں نے صرف چند نمونے پیش کئے ہیں۔ وَبٰرَكَ فِيۡهَا وَقَدَّرَ فِيۡهَاۤ اَقۡوَاتَهَا (41:10) کے الفاظ کو سامنے رکھ کر غور کیجئے۔ انسان کے دل سے بیساختہ آواز اٹھتی ہے کہ: الحمدللہ رب العالمین۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن اور شاعری

شاعری کیا ہے:

آپ نے دیکھا ہے کہ مخالفین حضور ﷺ کے متعلق یہ بھی کہتے تھے کہ آپ ﷺ ایک شاعر ہیں اس لئے آپ ﷺ جو کچھ کہتے ہیں وہ حقیقت پر مبنی نہیں اور نہ ہی اس قابل کہ اس پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ قرآن کریم نے اس کی تردید کی اور فرمایا کہ:

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿۶۹﴾ (36:69)

اور (دیکھو) ہم نے محمد (ﷺ) کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ ہی شاعری اس کے لئے مناسب ہوسکتی ہے یہ (کتاب) اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ (پیامِ حق کی) یاددہانی واضح قرآن ہے۔ یعنی یہ کہ آپ شاعر نہیں اس لئے کہ شاعری ایک پیغمبر کی شایانِ شان ہی نہیں۔ اس سے بظاہر مترشح ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے شعروشاعری کی سخت مخالفت کی ہے اور اسے مسلک پیغمبری کے خلاف قرار دیا ہے۔ قرآن کی آیات سے یہ استنباط وضاحت طلب ہے۔

زبان، اظہار مدعا کا ذریعہ ہے اور نوع انسانی کے لئے بہت بڑا امتیاز۔ اس اظہار مدعا کے لئے انسانوں نے دو انداز اختیار کئے ہیں۔ ایک تو وہ جس میں روزمرہ باتیں کرتے ہیں۔ اسے نثر کہتے ہیں، دوسرے شعر، شعر کیا ہے؟ نثر کے الفاظ کو ایک خاص ترتیب میں رکھ دیا جاتا ہے اس اعتبار سے نثر اور نظم، الفاظ کی ترتیب کے دو مختلف اسلوب ہیں۔ قرآن کریم جو زندگی کے حقائق پیش کرتا ہے ایسی نیچی سطح پر نہیں اتر سکتا کہ ان دو اسالیب بیان میں سے ایک کی ایسی مذمت کرے کہ وہ کسی بلند شخصیت کے شایان شان ہی نہ رہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جب قرآن نے یہ کہا ہے کہ شاعری رسول کے شایانِ شان نہیں تو اس سے مقصود الفاظ کی وہ خاص ترتیب نہیں جس سے شعر موزوں ہوجاتا ہے بلکہ ایک خاص نفسیاتی کیفیت ہے۔

شاعر کی نفسیات:

جسے اس نے ''شاعری'' سے تعبیر کیا ہے۔ یہ نفسیاتی کیفیت یا مسلک حیات کیا ہے؟ اس کی قرآن نے خود ہی دوسرے مقام پر تشریح کردی ہے۔ قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ انسانی زندگی کا ایک خاص نصب العین ہے اور اس نصب العین کا حصول اس کی تمام جدوجہد کا مقصود۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اس کے نزدیک سفرزندگی میں منزل کی تعیین کا نام ہے ایمان، اور اس منزل تک پہنچنے کی کوششوں کا نام اعمال صالحہ، یہ ایمان اور عمل کی زندگی اس کے نزدیک انسانیت کی زندگی ہے۔ لہٰذا ایک مومن کی زندگی اور رسول

کے شایانِ شان اسلوبِ حیات۔ اس کے برعکس ایک دوسرا اسلوبِ زندگی ہے جس میں نہ انسان کی آنکھوں کے سامنے صحیح نصب العین ہوتا ہے نہ دل میں اس نصب العین کے حصول کی تڑپ اس کے جذبات اس کا معبود ہوتے ہیں اور ان کی تسکین اس کی زندگی کا منتہیٰ۔ یہ جذبات اس کی ناک (1) میں نکیل ڈالے اسے زندگی کی مختلف شاہراہوں پر ادھر ادھر لئے پھرتے ہیں۔ کبھی تصورات کی ان حسین وادیوں میں کبھی تخیلات کے اُن نگاہ فریب مناظر کی طرف، چونکہ زندگی کا نصب العین متعین نہیں ہوتا اس لئے آج جذبات کی رو میں کچھ کہہ رہے ہیں کل کچھ اور جس قسم کا جذبہ دل میں موجزن ہوا اسی قسم کی آواز زبان پر آ گئی۔ چونکہ جذبات کے اظہار کے لئے شعر کی زبان زیادہ موزوں سمجھی گئی ہے اس لئے جذبات پرستی کی اس نہج زندگی کا نام قرآن نے شاعری رکھا ہے جو ایک مومن کی زندگی کے بالکل برعکس زندگی ہے۔ یہ دو مختلف اسالیبِ حیات ہیں جن کا تقابل قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾ (26:224-226)

اور شاعروں کی پیروی ہمیشہ گم کردہ راہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ (اے پیغمبر!) تم نے دیکھا نہیں کہ وہ (روز) ہر (نئی) وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں؟ اور یہ کہ یہ لوگ وہ باتیں کہتے ہیں جو خود کرتے نہیں ہیں؟

یعنی نہ ان کے فکر کا صحیح مرکز متعین ہے اور نہ ان کے قول اور عمل میں تطابق یہ ہے نفسیاتِ شاعر اور وہ اسلوبِ حیات جس کی خصوصیت پریشانی فکر و نظر، آوارگی قلب و نگاہ اور فقدانِ عمل و کردار ہے اس کے برعکس ایک دوسرا اندازِ حیات ہے جس میں زندگی کا نصب العین متعین ہے اور انسان کا ہر قدم اس نصب العین کی طرف اٹھتا ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَیَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۷﴾ (26:227)

(وہاں) سوائے ان لوگوں کے جو (پیغامِ حق پر) یقین لے آئے ہیں اور جنہوں نے نیک کام کئے اور اللہ کو بہت یاد کیا اور اس کے بعد کہ ان پر ظلم کیا جا چکا انہوں نے اپنی مدافعت کی (یہ لوگ ایک متعین راستہ پر چلنے والے اور گفتار و کردار میں یکساں ہوتے ہیں) اور جن لوگوں نے (ان پر) ظلم کیا ہے وہ بہت جلد معلوم کر لیں گے کہ کس منزل کی طرف وہ پلٹ رہے ہیں۔

سورۂ شعراء کی ان آیات کے دونوں حصوں کو ایک مرتبہ پھر دیکھئے ان کے درمیان جو اِلَّا (مستثنیٰ) آیا ہے اس سے یہ مراد نہیں کہ "مسلم شعراء" ہدایت وسعادت کی راہ پر ہیں اس لئے قرآن کے نزدیک محبوب و مرغوب اور "غیر مسلم شعراء" ضلالت و غوایت پر ہیں اس لئے مغضوب و مبغوض، مفہوم اس سے یہ ہے کہ جو لوگ اوّل الذکر اندازِ زندگی اختیار کئے ہوئے

---

(1) اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ (45:23، 25:43) (اے پیغمبر! ﷺ) تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جنہوں نے اپنے خیالات ہی کو اپنا معبود بنا لیا ہے

ہیں وہ غلط روش پر جا رہے ہیں۔لیکن جو دوسرا انداز اختیار کئے ہیں وہ صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔قرآنی اندازِ زندگی اختیار کرنے والا اپنے مدعا کا اظہار نظم میں بھی کرے تو جائز اور درست۔غیر قرآنی اسلوب حیات اختیار کرنے والا اپنا مفہوم نثر میں ادا کرے تو بھی غلط۔قرآن اسالیب زندگی سے بحث کرتا ہے نہ کہ طرق اظہار مدعا سے۔لہٰذا قرآن نے جب ''شاعری'' کو غوایت کی راہ کہا ہے تو اس سے مفہوم ہے کہ وہ نفسیاتی کیفیت ہے جو انسان کو غلط روش زندگی پر لے جاتی ہے اور فکر وعمل کی دنیا میں کہیں کا نہیں رکھتی۔یہی وہ ''شاعری'' ہے۔

مسلمان شاعروں کی قوم بن چکی ہے:

جو ایک مدت سے مسلمانوں کے ہر شعبہ حیات پر مستولی ہے اور ان کی کسی کوشش اور تحریک کو باریاب نہیں ہونے دیتی۔اگر ان کی باتیں سنئے تو ایسا معلوم ہوگا گویا ایک سیلاب امنڈتا چلا آرہا ہے جو دنیا کی ہر قوت کو خس وخاشاک کی طرح بہا کرلے جائے گا اور جب عمل کی طرف آئے تو یہ حالت کی ادنیٰ سے ادنیٰ چوکھٹ پر بھی سجدہ ریزی کرلئے تیار۔اجتماعات قومی میں ان کے ریزولیوشنز کے الفاظ سے ان کے عزائم اور انہیں ان کے کردار کے ترازو میں تو لئے تو ایک پرکاہ ثابت ہوں گے جسے ہوا کا ہلکا سا جھونکا اڑائے اڑائے پھرے۔جذبات کی شعلہ مزاجی کا یہ عالم کہ ذرا سے اختلاف پر نعل بر آتش ہوجائیں گے لیکن عدم استقلال کی یہ کیفیت کہ بگولے کا سا یہ تمام رقص و وجد اور جوش وخروش آن کی آن میں خاک نشیں ہوجائے گا۔یہ تو ہے دنیائے عمل واستقامت میں ان کی حالت۔دوسری طرف پریشانیٔ فکر ونظر کا یہ عالم کہ ہر ٹولی کا قبلۂ مقصود الگ اور ہر گروہ کا کعبۂ مدعا جداگانہ۔چار اس کے پیچھے مصروفِ دشت پیمائی۔دس اس کے ساتھ مشغول صحرانوردی۔ہر گروہ ''فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ﴿۲۲۵﴾'' (26:225) کی عبرت ناک تصویر اور ہر جماعت ''يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ﴿۲۲۶﴾'' (26:226) کا تاسف انگیز مرقع اور اس طرح پوری کی پوری قوم اس ''شاعری'' کا عملی پیکر جس کی قرآن نے یوں مذمت کی ہے، لیکن بایں ہمہ یوں فریب میں مبتلا کہ یہ مذمت دوسروں کی کی گئی ہے ہماری نہیں، اس لئے کہ ہم تو ''اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ'' (26:227) کے استثناء میں آگئے ہیں۔

خدا ایں سخت جاں را یار بادا　　که افتاد است از بام بلندے

مفہوم: خدا اس سخت کاں کا دوست ہو، کہ یہ بہت اونچی چھت سے گرا ہے۔(س۔ا)

آیۂ زیر نظر کے آخری ٹکڑا پر ایک مرتبہ پھر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ وہ صاحبِ ایمان وعمل گروہ کو فقط باتیں بنانے والوں سے کس طرح متمیز کرکے رکھ دیتی ہے، بایں نمط کہ کسی دیکھنے والے کو ان میں امتیاز کی دشواری ہی پیش نہ آئے۔دونوں گروہ، ایک دوسرے سے الگ کھلے کھلے اور واضح طور پر متمیز۔اس گروہ کی خصوصیات میں فرمایا کہ:

1۔وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا﴿۲۱﴾ (33:21) وہ اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے ہیں۔

2۔وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ط (26:227)

جب ان پر کسی طرف سے دراز دستی ہو تو وہ اس کی مدافعت کرتے ہیں۔

3۔جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ: وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿٢٢٧﴾ (26:227)

ظلم کرنے والوں کو فوراً نظر آ جاتا ہے کہ ان کا کیا حشر ہونے والا ہے۔

''اللہ کا ذکر'' کس طرح کیا جاتا ہے، اس کی تفصیل، معارف القرآن، جلد سوم (عنوان بنی اسرائیل) میں گذر چکی ہے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ اس سے مراد ''خانقاہوں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں، سر بزانو، ہزار ہزار دانوں کی تسبیح پر زبان سے اللہ کا نام دہراتے رہنا اور عملاً ہر طاغوتی قوت کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر قانع رہنا نہیں بلکہ دنیا سے غیر خدائی قوتوں کے غلبہ واستیلاء کو مٹا کر اس کی جگہ حکومتِ خداوندی کو قائم کرنا۔'' اس کی عملی تفسیر یوں ہوگی کہ دنیا میں جہاں کہیں جور و تعدی اور ظلم و ستم برپا کرنے والی سرکش قوتیں سر اٹھائیں گی، ''اللہ کا ذکر'' کرنے والے مجاہدین اٹھیں گے اور حق وصداقت اور عدل و انصاف کی مدافعت میں، ہتھیلیوں پر سر لئے میدان عمل میں نکل آئیں گے اور ان طاغوتی قوتوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیں گے۔ یہ ہے نشانی اس جماعت کی جسے قرآن نے ''شاعروں کے گروہ'' کے مقابلہ میں امتیازی طور پر پیش کیا ہے۔ اب آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ قرآن کی زبان میں ''شاعر'' کسے کہتے ہیں اور وہ کیوں اس قابل نہیں کہ اس کی اتباع کی جائے۔ مومن شاعری نہیں کرتا۔ کام کرتا ہے۔

ما بمیداں سر بجیب، او سر بکف

مفہوم: ہم میدانِ (جنگ) میں اپنے گریبان میں سر جھکائے (محوِ فکر) ہیں جب کہ وہ (مومن) اپنے سر کو ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہیں۔ (س۔ا)

اس کی تو شان یہ ہے کہ؎

جانِ او پائندہ تر گردد ز موت — بانگ تکبیرش بروں از حرف و صوت
پادشاہاں در قباہائے حریر — زرد رو از سہم آں عریاں فقیر
کارِ ما وابستۂ تخمین و ظن — او ہمہ کردار و کم گوید سخن!

اس لئے

محرم او شو ز ما بیگانہ باش — خانہ ویراں باش و صاحب خانہ باش

مفہوم: اس کی زندگی کو موت سے ہمیشگی ملتی ہے اور اس کی تکبیر الفاظ اور آواز سے ماوراء ہوتی ہے۔

وہ بادشاہ جنہوں نے ریشمی قبائیں زیب تن کی ہوتی ہیں اس عریاں فقیر کے سامنے سہم کر زردرُو لگتے ہیں۔

ہمارا کام تخمینہ اور قیاس تک محدود ہے جبکہ وہ مجسم کردار ہے اور باتیں بہت کم کرتا ہے۔

اس (کردار کے حامل مومن) کا محرم بن جا اور مجھ جیسے (بے عمل) سے بے گانہ ہو جا۔ یہ بظاہر خانہ ویرانی اصل میں صاحبِ خانہ بن جانا ہے۔

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الصلوٰۃ سے زندگی کا ربط

ایک دو جگہ نہیں، کئی سو جگہ قرآن مجید میں صلوٰۃ کا حکم، صلوٰۃ کا مقصد، اہل صلوٰۃ کی مدح وغیرہ موجود ہے۔ ہمیں اس وقت ان کی تفصیلات میں جانا نہیں، بلکہ صلوٰۃ کے ایک خاص پہلو کو اجاگر کرنا ہے اس زاویۂ نظر سے اگر صلوٰۃ کو نہ دیکھا جائے تو صرف صلوٰۃ ہی کی نہیں بلکہ پورے نظام عبادت کی وسیع دُنیا ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند ہو کر رہ جاتی ہے۔ صلوٰۃ کا ترجمہ ہماری زبان میں ''نماز'' کیا جاتا ہے۔ ہم بھی یہی لفظ استعمال کریں گے لیکن نماز کو محض چند حرکات و کلمات نہ سمجھا جائے۔ بلکہ اس سے صلوٰۃ ہی کا وہ وسیع مفہوم سمجھئے جس کی تھوڑی سی تشریح اس وقت پیش کرنا چاہتے ہیں۔

> صلوٰۃ کو عموماً ہر جگہ اقامت سے وابستہ کیا گیا ہے۔ کہیں یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ کہا گیا ہے اور کسی جگہ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ ہے اور کسی جگہ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وغیرہ۔ جہاں صلوٰۃ اقامت کے بغیر ہے، وہاں نماز پڑھنا ہی سمجھنا چاہئے

پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ صلوٰۃ کو عموماً ہر جگہ اقامت سے وابستہ کیا گیا ہے۔ کہیں یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ کہا گیا ہے اور کسی جگہ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ ہے اور کسی جگہ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وغیرہ۔ جہاں صلوٰۃ اقامت کے بغیر ہے، وہاں نماز پڑھنا ہی سمجھنا چاہئے۔ مثلاً: مِنۡ قَبۡلِ صَلٰوۃِ الۡفَجۡرِ وَحِیۡنَ تَضَعُوۡنَ ثِیَابَکُمۡ مِّنَ الظَّہِیۡرَۃِ وَمِنۡۢ بَعۡدِ صَلٰوۃِ الۡعِشَآءِ (24:58) وغیرہ۔

اقامت کے معنی ہیں قائم کرنا، قائم رکھنا۔ یہ لفظ کسی ایسے کام کے لئے نہیں آتا جو چند منٹ کے لئے ہوا اور پھر ختم ہو جائے۔ قرآن میں ہے۔ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ (42:13) دین قائم کرو۔ اس کا یہ مفہوم نہیں کہ چند منٹ یا چند دن کے لئے دین قائم رکھو، اس کے بعد ختم کر دو۔

اور اقامتِ حدود اَنۡ یُّقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰہِ (2:230) کا مطلب بھی اس کا مستقل قیام ہے۔ وَاَقِیۡمُوا الۡوَزۡنَ بِالۡقِسۡطِ (55:9) کا یہ مطلب نہیں کہ کبھی برابر تو لو اور کبھی ڈنڈی مار لو، بلکہ یہ ایک مستقل کاروبار ہے۔

مختصر یہ کہ صرف نماز پڑھ لینے کا کام تو چند منٹ میں پورا ہو جاتا ہے، اس لئے اس پڑھ لینے پر لفظ اقامت صادق نہیں آتا۔ اقامت ایک ایسا فعل ہے جس میں قیام ودوام ہوتا ہے۔ گویا اقامت صلوٰۃ ایک نظام ہے جو چند منٹ بعد ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ دوامی طور پر قائم رہتا ہے۔ نماز کے کلمات وحرکات ایک جز وقتی اظہار ہے ہمہ وقتی نظام صلوٰۃ کا اور یہ ایک ایسا نظام ہے جو پوری زندگی کے اعمال وظائف کو اپنی آغوش میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ایک فوجی سپاہی جب اپنی پریڈ سے فارغ ہو جاتا ہے تو اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اب یہ فوجی سپاہی نہیں رہا۔ وہ بہرحال ہمہ وقتی فوجی سپاہی ہے، پریڈ سے پہلے بھی پریڈ کے وقت بھی اور پریڈ کے بعد بھی۔

اسی طرح ایک نمازی صرف اسی وقت نمازی نہیں رہتا، جب وہ نماز پڑھ رہا ہوتا ہے۔ وہ پڑھنے سے پہلے، پڑھنے کے دوران اور پڑھ چکنے کے بعد ہر حال میں نمازی ہے۔ کیونکہ اس کی پوری زندگی نماز ہے، اگر وہ مومن ومسلم ہے۔ اگر نماز پڑھنے سے پہلے اور بعد میں اس کی زندگی نماز نہیں تو اس کی نماز صرف پڑھ لینا تو ہے لیکن اقامت صلوٰۃ نہیں۔

> کیا یہ اُڑتے ہوئے پرندے وضو کرتے ہیں؟ اذان کہتے ہیں؟ قبلہ رو ہو کر نیت باندھتے ہیں؟ قیام، رکوع، قومہ، سجود، تشہد کر کے سلام پھیرتے ہیں؟ یقیناً نہیں۔ پھر ان کی نماز کا کیا مطلب ہوا؟ ظاہر ہے کہ ان کی صلوٰۃ کا مطلب فرائض وجود کی ادائیگی ہے

صلوٰۃ کو قرآن نے جہاں نماز پڑھنے کے معنی میں لیا ہے۔ وہاں اس کا ایک بہت وسیع مفہوم بھی لیا ہے اور یہ معنی اقامتِ صلوٰۃ کے مفہوم سے قریب ترین رشتہ رکھتا ہے۔

ارشاد قرآنی ہے کہ:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۱﴾ (24:41)

یعنی کیا تم دیکھتے نہیں کہ جو بھی زمین وآسمان میں ہے، وہ اور پروں کو پھیلائے ہوئے پرندے سب اللہ کی تسبیح کرتے ہیں۔ یہ سب کے سب اپنی صلوٰۃ اور تسبیح سے واقف ہیں اور یہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ اسے جانتا ہے۔

ذرا سوچئے۔ کیا یہ اُڑتے ہوئے پرندے وضو کرتے ہیں؟ اذان کہتے ہیں؟ قبلہ رو ہو کر نیت باندھتے ہیں؟ قیام، رکوع، قومہ، سجود، تشہد کر کے سلام پھیرتے ہیں؟ یقیناً نہیں۔ پھر ان کی نماز کا کیا مطلب ہوا؟ ظاہر ہے کہ ان کی صلوٰۃ کا مطلب فرائض وجود کی ادائیگی ہے جو ان کی اپنی اپنی جبلت وفطرت کے مطابق ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسان کی صلوٰۃ کا مطلب بھی اس کے فرائض زندگی کی ادائیگی ہے اور یہی اقامت صلوٰۃ کا مفہوم ہے۔ محض صلوٰۃ یا نماز پڑھنا صرف ایک حصہ ہے اس پورے نظام اقامت کا جس کا تعلق انسان کی اختیاری زندگی سے ہے۔ وہ سپاہی کبھی سپاہی تصور نہیں کیا جاسکتا جو پریڈ میں حاضر ہو جایا کرے۔ لیکن نہ تو سپاہی کی زندگی اختیار کرے اور نہ سپاہی کے فرائض ادا کرے۔ مومن اللہ کا سپاہی ہے اور اس کا

حال بھی اس سیاہی سے مختلف نہیں۔

غرض فرائض زندگی میں صرف نماز پڑھ لینا نہیں ہے۔ بے شمار دوسری چیزیں بھی ہیں۔ چوبیس گھنٹوں کی تمام نمازیں زیادہ سے زیادہ دو چار گھنٹے لے سکتی ہیں، باقی بیس بائیس گھنٹے کیا صلوٰۃ سے خالی رہنے چاہئیں؟ اگر وقت کا یہ بڑا حصہ صلوٰۃ سے خالی ہو اور صرف فرض و نفل نمازیں ادا کر لی جائیں تو ادائے صلوٰۃ تو شاید ہوجائے لیکن اقامتِ صلوٰۃ نہیں ہوسکتی۔ اقامتِ صلوٰۃ تو وہ پورا نظام ہے جس کی اقامت ساری زندگی کے وظائف و اعمال پر حاوی و محیط ہوتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں اسے یوں کہئے کہ صلوٰۃ میں وہ تمام ذرائع و وسائل بھی داخل ہیں جو صلوٰۃ تک پہنچاتے ہیں یا جن کے بغیر ادائے صلوٰۃ نہیں ہوسکتی۔ اور اس صلوٰۃ میں وہ تمام مقاصد و نتائج بھی شامل ہیں جن کی تکمیل بذریعہ صلوٰۃ ہوتی ہے اس کی کچھ تشریح بھی سُن لینی چاہئے، اس سے کچھ اندازہ ہو سکے گا کہ یہ اقامت صلوٰۃ کا نظام کس طرح پوری زندگی کے وظائف و اعمال پر حاوی ہے۔

ذرا غور کیجئے!

1۔ فرض نماز اجتماعی طور پر ادا کی جاتی ہے اور جس جگہ ادا کی جاتی ہے اسے مسجد کہتے ہیں۔ ہر دور کے تمدن اور ہر ملک کے موسمی حالات کے مطابق مسجد تعمیر کرنا صلوٰۃ ہی کا ایک جزو ہے۔ یہ مساجد ہماری اجتماعی تربیت کا مرکز ہوتی ہیں لیکن یہ یوں ہی نہیں بن جاتیں۔ موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق اس میں پختہ اینٹیں، سیمنٹ، لوہا، لکڑی، رنگ، نقش و نگار، خطاطی، سنگ تراشی، انجینئرنگ، سمت کعبہ کی درستی وغیرہ سب کچھ صلوٰۃ ہی کا حصہ ہے۔

دوسرے لفظوں میں اینٹوں کا بھٹہ لگانا بھی صلوٰۃ ہے، سیمنٹ کا کارخانہ چلانا، لوہے کی فیکٹری لگانا، لکڑی چیرنے کی آرا مشین اور کارپینٹری، رنگ تیار کرنا، عمدہ نقش و نگار اور خطاطی کا فن، سنگ تراشی کا ہنر، انجینئری، سمتِ کعبہ درست کرنے کا جغرافیائی علم، چٹائیاں اور دریاں بنانے کا کام سب کچھ صلوٰۃ ہے۔ اگر وہاں گھڑی لگاتے ہیں تو گھڑی سازی کا کام بھی صلوٰۃ ہے، وہاں اگر برقی پنکھے، قمقمے اور لاؤڈ اسپیکر لگائیں تو پاور ہاؤس قائم کرنا بھی صلوٰۃ ہے۔ یہ تمام باتیں ہر جگہ اور ہر مسجد میں فی الحال نہیں اور ان میں کئی چیزیں ایسی بھی ہیں جن کے بغیر مسجد کا کام چل رہا ہے۔ لیکن اس کے جتنے ضروری اجزاء امکان و استطاعت کے مطابق شامل مسجد ہیں، وہ بہر حال صلوٰۃ ہیں اور آئندہ جو چیزیں شامل مسجد ہوتی رہیں گی، وہ بھی داخل صلوٰۃ ہوں گی۔ مسجد کا صلوٰۃ سے اتنا گہرا ربط ہے کہ قرآن میں عبادت گاہ کو موضع الصلوٰۃ کی بجائے تنہا، صلوٰۃ ہی کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔

لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ (22:40)

پس خود مسجد (سجدہ گاہ) صلوٰۃ ہے تو مسجد جن اجزاء سے مرکب ہوگی وہ سب صلوٰۃ ہی ہوں گے۔

2۔ اس کے بعد دیکھئے صلوٰۃ کے لئے طہارت بدنی بھی ضروری ہے۔ بصورتِ جنابت غسل قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ

فَاغۡسِلُوۡا وُجُوۡهَكُمۡ وَاَيۡدِيَكُمۡ (5:6) بدنی طہارت کے علاوہ کپڑوں کی طہارت بھی ضروری ہے۔ ان تمام طہارتوں کے بغیر نماز نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا طاہر ومطہر پانی حاصل کرنے کے جتنے وسائل ہیں وہ سب صلوٰۃ ہی ہیں۔ خواہ وہ کنوئیں کی کھدائی ہو یا ہینڈ پمپ کے لیے بورنگ کا ہنر ہو یا پائپ کے ذریعے ٹوٹیوں تک پانی لانے کے لئے واٹر ورکس کا انتظام ہو، سب کچھ صلوٰۃ ہی ہے۔

3۔ ستر پوشی بھی نماز کے لیے ضروری ہے خُذُوۡا زِيۡنَتَكُمۡ عِنۡدَ كُلِّ مَسۡجِدٍ (7:31) پس گرم وسرد کپڑے تیار کرنے کے لئے جتنی ملیں یا کھڈیاں ہیں وہ بھی صلوٰۃ ہیں بلکہ انہیں سینے کے سوئیاں، مشینیں اور دھاگے تیار کرنا بھی صلوٰۃ ہے۔ کیونکہ ان چیزوں کے بغیر وہ ستر پوشی نہیں ہوسکتی جو نماز کے لئے ضروری شرط ہے۔

4۔ نماز میں شریک ہونے کے لئے جسمانی صحت بھی ضروری ہے۔ لہٰذا خالص غذاؤں کا اہتمام اور میڈیکل سائنس اور دوائیں تیار کرنے والے کارخانے بھی صلوٰۃ ہیں۔

5۔ نماز میں یکسوئی خشوع وخضوع اور حضورِ قلب بھی ضروری ہے۔ لہٰذا ایسا ہموار معاشرہ قائم کرنا بھی صلوٰۃ ہے، جس کا عادلانہ نظام ذہنوں کو سکون بخشے۔ جہاں کی معاشی بدحالی دلوں کا چین نہ چھین لے، جہاں نہ حزنِ دوش ہو اور نہ فکرِ فردا۔ جہاں چوری، اغواء، قتل، ڈاکہ، غصب، ظلم، ناانصافی، جانبداری، طبقاتی تفاوت وغیرہ کا کوئی خوف نہ ہو۔

جہاں ہر ایک کے پاس مکان ہو۔ بال بچوں کی تعلیم، تربیت علاج، خوراک، پوشاک اور روزگار کے لئے ترسنا نہ پڑے۔ جہاں پر فرد کو ترقی کے لئے یکساں مواقع حاصل ہوں اور ہر شخص کو جینے کا حق، خوش اور پُرسکون رہنے کا حق حاصل ہو۔ ایسا معاشرہ قائم کرنا صرف جزوِ صلوٰۃ نہیں عین صلوٰۃ ہے۔

ایسی عین صلوٰۃ جو صلوٰۃ کا اصل مقصد ہے اور صلوٰۃ کا لازمی تقاضا ہے۔ ایسا معاشرہ قائم کرنے کی ہر کوشش عین جہاد فی سبیل اللہ ہے اور اس کوشش سے غفلت بے اعتنائی اور کوتاہی برتنا جہاد سے صریح روگردانی ہے۔ اس جہاد کے بغیر محض نماز پڑھ لینا ایک بے روح بے کیف اور بے معنی سا عمل ہے۔

نتیجہ:

آپ نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ محض نماز پڑھ لینا بس ایک عمل نماز ہے، لیکن یہ اقامت صلوٰۃ نہیں۔ اقامتِ صلوٰۃ کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ زندگی کا کوئی گوشہ اس سے خالی نہیں۔

صلوٰۃ جب مسجد کی چاردیواریوں سے باہر نکلتی ہے تو پوری زندگی پر پھیل کر اقامتِ صلوٰۃ بنتی ہے اور وہ ساری کوششیں جو اس نظام کے قیام کے لئے ہوں جہاد ہوتی ہیں اور اس جہاد میں جنگ، صلح معاہدہ، جنگی تیاریاں، اسلحہ سازی حکمت عملی غرض سب کچھ صلوٰۃ ہی ہوگی۔ کیونکہ سب کا مقصد اقامتِ صلوٰۃ ہی ہے۔

یہ عجیب بات ہوگی کہ صرف نماز پڑھ لینا تو صلوٰۃ ہو اور وہ تمام چیزیں صلوٰۃ سے خارج ہوں جن کے بغیر نماز ہی نہیں

ہوتی، یا محض رسمی نماز ہوتی ہے۔

صلوٰۃ وزکوٰۃ کا ربط:

اس سلسلے میں ایک بڑی حقیقت اور بھی پیش نظر رکھنی چاہئے اور وہ یہ ہے کہ قرآن میں بیشتر جگہ صلوٰۃ سے زکوٰۃ کو وابستہ رکھا گیا ہے۔عموماً اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کو ایک ساتھ ہی بیان کیا گیا ہے۔جس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں، اور دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔زکوٰۃ بھی صلوٰۃ کی طرح ایک پورا نظام ہے اور صلوٰۃ ہی کی طرح زکوٰۃ بھی تفصیل چاہتی ہے۔لیکن یہاں مختصر لفظوں میں دونوں کا ناقابل انقطاع ربط معلوم کرنے کے لیے اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ زکوٰۃ ایک ایسا معاشی نظام ہے جو سب کو خوشحال کر دے اور کوئی کسی کا محتاج نہ رہے۔یعنی دولت کی گردش ایسے انداز سے ہوتی رہے کہ سب کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔

> قوم شعیبؑ بھی اچھی طرح سمجھتی تھی کہ صلوٰۃ کا مطلب صرف نماز کا پڑھ لینا نہیں بلکہ اس کا تعلق براہِ راست مال و دولت کے کنٹرول سے بھی ہے،مگر یہ معمولی سا نکتہ ابھی تک ہمارے پڑھے لکھے لوگوں کی سمجھ میں بھی مشکل سے آتا ہے۔

یہی وہ معاشرہ ہے جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔زکوٰۃ کا یہ مطلب سمجھنا صحیح نہیں کہ ایک طبقہ دولت مندوں کا دوسرا خیرات پر پلنے والوں کا ہمیشہ موجود رہے۔اگر خوشحالی اتنی عام ہو جائے کہ کوئی زکوٰۃ کا لینے والا باقی نہ رہے تو نہ اللہ اور رسول ﷺ کو اس کا افسوس ہوگا نہ اسلام کو اس سے کوئی صدمہ و نقصان پہنچے گا۔ بلکہ خوشی ہوگی کہ اسلام کا اصل مقصد پورا ہو رہا ہے۔قتال کے ہزار فضائل ہوں لیکن یہ مقصود نہیں۔مقصد امن و سلامتی ہے۔اگر امن قائم ہو کر قتال ختم ہو جائے تو اس سے اسلام کے حکم قتال کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ بلکہ مقصدِ قتال پورا ہو جائے گا۔اسی طرح اگر خوشحالی عام ہو کر زکوٰۃ کا سسٹم ختم ہو جائے یعنی کوئی زکوٰۃ لینے والا غریب نہ رہے تو زکوٰۃ کا عظیم مقصد پورا ہو جائے گا۔اس سے کسی اسلامی حکم کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔اس مقصد کی تکمیل اگر ڈھائی فیصد لینے سے پوری ہو تو ڈھائی فیصد لیا جائے گا۔اگر زیادہ کی ضرورت ہو تو زیادہ وصول کیا جائے۔

اِنَّ فِی الْمَالِ لَحَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃِ (ترمذی عن فاطمہ بنت قیس)

اگر عفو یعنی زائد از ضرورت کل کی کل پونجی کی ضرورت ہو تو ’’عفو‘‘ لے لیا جائے اور کچھ بھی لینے کی ضرورت نہ ہو تو کچھ بھی نہ لیا جائے گا۔یعنی ہر شخص محنت کر کے اپنا ثمرہ محنت (پیداوار) مملکت کے حوالے کر دے گا اور نمائندہ گانِ مملکت اس کی تمام ضروریات کے ذمہ دار ہوں گے۔ایسے نظام کا آپ جو بھی چاہیں نام رکھ لیں اس سے بحث نہیں،لیکن اسلامی نظام زکوٰۃ سے اس کا کوئی ٹکراؤ نہیں بلکہ نظام زکوٰۃ کے مقصد کی تکمیل ہے۔

نظام زکوٰۃ اور اقامتِ صلوٰۃ دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔دونوں ایثار بے لوثی چاہتے ہیں۔دونوں ایک

دوسرے کے مددگار ہیں اور دونوں مل کر اخلاق و معاش کے نظام کی تکمیل کرتے ہیں۔

اقامت صلوٰۃ کا مقصد نظام زکوٰۃ کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا۔ اخلاق اور معاش دونوں ایک دوسرے سے ایسے مربوط اور پیوستہ ہیں کہ اُن کو جدا نہیں کیا جاسکتا۔

قرآن پاک نے قصہ شعیب علیہ السلام میں اس حقیقت کو یوں بے نقاب کیا ہے کہ سیدنا شعیبؑ کا پیغام سن کر آپ کی اُمت نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ آپؑ کے پیغام صلوٰۃ کا مالیات پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اُمت نے سوال کیا:

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ (11:87)

ترجمہ: اے شعیب! کیا تمہاری صلوٰۃ تمہیں یہ حکم دیتی ہے کہ ہمارے بزرگانِ خاندان جس چیز کی عبادت کرتے آئے ہیں اُسے بھی چھوڑ دیں اور اپنے مال و دولت میں جو تصرف کرنا چاہیں وہ بھی نہ کریں!

> یہ دولت ہی ہے جو ہمیشہ سے اب تک دنیا میں کشمکش کا سبب رہی ہے یعنی دُنیا میں رسمی نماز طبقاتی کشمکش کا سبب کبھی نہیں ہوئی۔ اگر ہوئی ہے تو صرف وہی نماز جس کو قوم شعیب علیہ السلام نے بھانپ لیا تھا

آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ قوم شعیبؑ بھی اچھی طرح سمجھتی تھی کہ صلوٰۃ کا مطلب صرف نماز کا پڑھ لینا نہیں بلکہ اس کا تعلق براہِ راست مال و دولت کے کنٹرول سے بھی ہے، مگر یہ معمولی سا نکتہ ابھی تک ہمارے پڑھے لکھے لوگوں کی سمجھ میں بھی مشکل سے آتا ہے۔ حالانکہ اس دور میں یہ حقیقت بالکل بے نقاب ہوچکی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے پیغام کا یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ بس نماز پڑھے جاؤ اور دُنیا میں جو کچھ ہورہا ہے، وہ ہونے دو اور چونکہ ہر ایک کا مال اس کی ''ملکیت'' ہے، اس لئے اس میں کوئی دخل نہ دو۔

طبقاتی کشمکش کا اصلی سبب:

واقعہ یہ ہے کہ آدم سے لے کر تا ایں دم دُنیا میں جتنی کشمکش ہوتی رہی ہے اس کی تہہ میں محض نماز روزہ کارفرما نہ تھا۔ روزے نماز سے اہل کفر کو کیا تکلیف تھی جو اہل ایمان اور پیغمبروں کی شدید مخالفت پر اتر آتے تھے؟ اہل کفر و شرک تو آج بھی نماز روزے کے پابند حضرات کے معتقد ہوتے ہیں اور انہیں بے نماز روزے خور سے بہتر ہی سمجھتے ہیں۔ ان کی انبیاءؑ اور مومنین جیسے پاکباز لوگوں کی دشمنی کرنے کی وجہ صرف نماز روزہ نہ تھی۔

اہل کفر اور اہل ایمان کی کشمکش کا سبب صرف یہ تھا کہ اسلام یعنی انبیاء سے انہیں اپنے مالی مفاد (ویسٹڈ انٹرسٹ) کو شدید خطرہ نظر آتا تھا اور واضح طور پر وہ سمجھتے تھے کہ یہ نماز صرف پوجا پاٹ نہیں۔ بلکہ سب سے پہلے یہ نماز استحصال کو ختم کرتی ہے۔ ان کے زائد از ضرورت مال پر ہاتھ ڈالتی ہے۔ ان کی وہ مسند اقتدار چھینتی ہے جو محض دولت و ثروت کے سہارے قائم

ہے۔ وہ ان تمام الٰہوں کو چکنا چور کرتی ہے جن میں سب سے بڑا مشہور الٰہ ثروت و دولت ہے۔ وہ صرف اس سونے کے بچھڑے ہی کی پوجا کو نہیں ختم کرتی جو سامری نے بنایا تھا۔ وہ سیم وزر کے ہر اس ڈھیر کو بت قرار دیتی ہے جسے قاضی الحاجات سمجھ کر اندوختہ کیا جاتا ہے اور ضرورت مندوں پر کُل کا کُل خرچ نہیں کیا جاتا۔ یہ بت پتھر کے بتوں سے کہیں زیادہ بڑا اور عزیز بت ہوتا ہے۔ اگر کسی بنئے سے یہ کہا جائے کہ یا تو تم لکشمی دیوی کا بُت ہمیں دے دو یا اپنی تجوری سے لاکھ روپے نکال کر ہمارے حوالے کر دو، ورنہ تمہاری جان کی خیر نہیں۔ تو وہ بنیا روپیہ کبھی نہیں دے گا۔ اپنا بت دے کر اپنی جان بچا لے گا۔ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ دولت لکشمی دیوی ہی کی برکت سے آئی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ اسے دولت پتھر کے معبود سے زیادہ عزیز ہے۔

> کس قدر عجیب بات ہے کہ ترازو کا ایک پلاّ جھک جائے تو رضائے الٰہی کے خلاف ہو لیکن اگر پوری سوسائٹی کا ایک پلڑا جھک جائے اور دوسرا اُٹھ جائے اور کسی بات میں بھی توازن برقرار نہ ہو تو وہ رضائے خداوندی کے عین مطابق سمجھا جائے

کشمکش کا سبب:

یہ دولت ہی ہے جو ہمیشہ سے اب تک دنیا میں کشمکش کا سبب رہی ہے یعنی دُنیا میں رسمی نماز طبقاتی کشمکش کا سبب کبھی نہیں ہوئی۔ اگر ہوئی ہے تو صرف وہی نماز جس کو قوم شعیب علیہ السلام نے بھانپ لیا تھا کہ یہ محض رسمی پرستش نہیں بلکہ معاشی انصاف کی داعی اور نظام عدل کے لئے ساعی ہے اور دولت مندوں کو اپنی ذات پر ضرورت سے زیادہ خرچ کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔

ایسی صلوٰۃ کی ترغیب آج بھی دیجئے تو سارے مقدس سرمائے دار درمیان میں وہی مذہبی دلیل پیش کریں گے جو قوم شعیبؑ نے پیش کی تھی کہ کیا تمہاری نماز تمہیں یہ حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے آبائی دین کو ترک کر کے اپنے مالی نظام سے دست بردار ہو جائیں، اگر آپ انہیں سمجھائیں کہ اسلامی نظام زکوٰۃ انسانوں کو امیر و غریب کے دو متخالف طبقوں میں بانٹ کر کشمکش کو باقی رکھنا نہیں چاہتا تو یہ لوگ اس وقت بھی قوم شعیب علیہ السلام کی طرح کہہ اٹھیں گے کہ:

مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ (11:91)

''تمہاری بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔''

قصصِ قرآنی اور تاریخی تقاضا:

قرآنی قصے دل بہلانے والی کہانیاں نہیں۔ وہ ایسے حقائق ہیں جن کو تاریخ دہراتی رہتی ہے۔ جو لوگ ان حقائق کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے، یا سمجھ کر چھپاتے ہیں وہ آخر کار داستان پارینہ یا عبرت کا نمونہ بن جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آج کے دور میں قوم شعیبؑ کی تاریخ دہرائی جا رہی ہے۔ اس قوم نے ترازو کی ڈنڈی مارنا اپنا پیشہ بنا لیا تھا لیکن شاید یہ جُرم اتنا بڑا نہ تھا کہ ان کا طبقہ الٹ دیا جاتا۔ یہ تو اُن کی پوری سوسائٹی کے معاشی نظام اور اس کے غیر عادلانہ کردار کا ایک علامتی نشان تھا۔ ان کا

اصلی جرم انسان کو دو غیر متوازن طبقوں میں بانٹ دینا تھا۔

ایک طرف بے نواؤں، مفلسوں اور فاقہ کشوں کی کراہتی ہوئی دنیا تھی اور دوسری جانب آسودہ حال عیش پسند مترفین کا ٹولہ تھا، جو دوسروں کو حق دیتے ہوئے ڈنڈی مارنا اپنا حق سمجھتا تھا۔

اسے ہنرمندی سمجھ کر دولت کے ڈھیر جمع کرتا اور اس ثروت کے بل بوتے پر ظلم کو روا رکھتا تھا اور سب سے بڑا ظلم یہ تھا کہ اپنی دولت میں دوسرے حقداروں کا حق ایک لایعنی فعل سمجھتا تھا۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ ترازو کا ایک پلڑا جھک جائے تو رضائے الٰہی کے خلاف ہو لیکن اگر پوری سوسائٹی کا ایک پلڑا جھک جائے اور دوسرا اُٹھ جائے اور کسی بات میں بھی توازن برقرار نہ ہو تو وہ رضائے خداوندی کے عین مطابق سمجھا جائے۔

قوم شعیبؑ کا جرم یہی تھا کہ وہ اپنی دولت میں سے کسی کا حصہ نکالنا نہ چاہتی تھی اور اسے اس کی ترغیب دی جاتی تو وہ یہ طنز کرتی کہ یہ اچھی صلوٰۃ ہے جو ہماری اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرنے نہ کرنے پر کنٹرول کرتی ہے۔

قصہ مختصر صلوٰۃ اور زکوٰۃ کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ مالی نظام اور معاشی عدل کے بغیر رسمی نماز تو ہو سکتی ہے اقامت صلوٰۃ نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ اقامتِ صلوٰۃ زندگی کے جن بیشمار گوشوں کو محیط ہے، ان کی تکمیل کے لئے مالی ایثار، دولت کی صحیح تقسیم، معاشی عدل اور گردش دولت ناگزیر ہے۔ اس لئے نظام زکوٰۃ بھی اقامتِ صلوٰۃ ہی کا ایک ضروری حصہ سمجھنا چاہیے۔

اخلاقی و روحانی اقدار:

صلوٰۃ کا نتیجہ قرآن نے یوں بتایا ہے:

۔۔۔اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ ؕ ۔۔۔(45:29)

''یقیناً نماز بے حیائی اور ناپسندیدہ باتوں سے بچاتی ہے۔''

صلوٰۃ سے اگر یہ مقصد حاصل نہ ہو تو وہ صلوٰۃ کی ایک ظاہری رسم کی ادائیگی ہوگی۔ مقصد صلوٰۃ کا حصول دراصل اقامتِ صلوٰۃ ہی کا ایک اہم حصہ ہے۔ ایک غیر عادلانہ سوسائٹی بجائے خود ایک بڑی ناپسندیدہ بے حیائی ہے۔ ایسی سوسائٹی میں بے حیائیوں اور جرائم کی فراوانی کوئی تعجب کی بات نہیں۔

جس کے پاس ضروریات زندگی کی تکمیل کا سامان نہ ہو وہ اپنی تکمیل ضروریات کے لئے سب کچھ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جو خلافِ جہاد اور خلاف تقویٰ ہوتا ہے۔ وہ رشوت بھی لے گا چوری بھی کرے گا۔ ڈنڈی بھی مارے گا۔ ملاوٹ اور اسمگلنگ، چور بازاری میں بھی تعاون کرے گا، حتیٰ کہ جسم فروشی تک مجبور ہوگا۔ کیونکہ اس کے زندہ رہنے کا سامان اسے میسر نہیں۔

دوسری طرف وہ طبقہ مترفین ہوتا ہے، جو ضروریات سے بہت زیادہ اندوختہ کر لیتا ہے اور اسی مالی فراوانی کے بل بوتے پر ہر قسم کی ناپسندیدہ بے حیائیوں کا ارتکاب کرتا رہتا ہے۔ وہ دوسروں کی محنت اور عصمت دونوں کو خریدتا ہے۔ انہیں ایسی

گومگو کی حالت میں رکھتا ہے کہ وہ نہ زندہ رہ سکیں نہ مر سکیں اور پھر مجبور ہوکر اپنی شکم پُری کے لئے ہر قسم کے جرائم کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ غرض دونوں طبقوں کی زندگیاں فحشا و منکر کا مظہر بن جاتی ہیں اور ان کی مثال ایسی ہو جاتی ہے جیسے ایک شخص جاری نہر کو روک کر سارا پانی اپنے کھیت میں ڈال لے اور دوسرے کی کھیتی میں پانی نہ جانے دے۔

اس روش کا ایک ہی نتیجہ ہوتا ہے کہ ایک کی کھیتی پانی کی زیادتی سے گل جاتی ہے اور دوسرے کی کھیتی پانی نہ ملنے سے جل جاتی ہے۔ نقصان دونوں کا ہوتا ہے۔ اگر اپنے حق کا پانی اعتدال کے ساتھ حاصل کرے اور دوسرے کے لئے باقی حصہ چھوڑ دے تو دونوں کی کھیتیاں سیراب ہوکر لہلہا اُٹھیں گی اور دونوں کا بھلا ہوگا۔ یعنی دونوں طبقوں کے کردار میں اعتدال اور تقویٰ پیدا ہوکر معاشرہ فحشا و منکر سے پاک ہوگا اور صلوٰۃ کا مقصد پورا ہوگا۔

دوسرے لفظوں میں اقامتِ صلوٰۃ کا دائرہ صرف مادّی ضروریات ہی تک محدود نہیں رہے گا بلکہ کردار کی بلندی، اخلاق کی درستی، اقدار کی تخلیق بھی ہوگی۔ دیکھئے اقامتِ صلوٰۃ کی گیرائی کہاں تک پہنچی ہوئی ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ میں تو پوری انفرادی اجتماعی زندگی اور زندگی کے سارے اعمال و وظائف آجاتے ہیں۔ اس میں مساوات انسانی کی تربیت بھی ہے ۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز　　　نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

اس میں تنظیم اور ڈسلپن بھی ہے کہ ایک ایک آواز (Caution) پر پوری جماعت کھڑی ہوتی، جھکتی اور سربسجود ہوتی ہے۔

اس میں ایک ندائے ''حی علی الصلوٰۃ'' پر سب کے یکجا ہونے کی تعلیم بھی ہے۔ یہ کسی نیکی کے لئے ایک آواز پر جمع ہوکر تعاون کی مشق بھی ہے۔

اس میں وقت کی پابندی بھی ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا﴿۱۰۳﴾ (4:103)

اس میں انسانی بڑائی کا خاتمہ اللہ کی کبریائی کے اقرار سے ہو جاتا ہے۔ اللہ اکبر بڑائی کرنے والوں کا احساس برتری اور دبے ہوؤں کا احساس کمتری ایک ساتھ دور کر دیتا ہے۔

یہ ساری باتیں اس وقت اپنا اثر دکھاتی ہیں جب مسجد کے اندر کا یہ انداز مسجد سے باہر نکلنے کے بعد بھی قائم رہے۔ اگر یہ تربیت مسجد کی چار دیواری میں بند رہے تو صرف صلوٰۃ ہے اور اگر اس کا ظہور مسجد سے باہر پورے معاشرے میں ہو تو اقامتِ صلوٰۃ ہے۔ کیونکہ اس وقت یہ صرف پرستش یا پوجا پاٹ کی رسمی نماز نہیں رہتی بلکہ پوری زندگی کے وظائف و اعمال کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

جمیل احمد عدیل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فکرِ پرویز۔۔۔ایک مختصر ترین تاثر

جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے، یہ کوئی تیس بتیس سال پرانی بات ہے، یعنی یہی کوئی آٹھ دس برس کی عمر میں ہماری سماعت سے یہ فقرہ ٹکرایا تھا ''لو جی! مسلمانوں میں پرویزیوں کے نام سے ایک نیا فرقہ ایجاد ہو گیا ہے۔'' یہ الفاظ ہمارے ایک پیر پرست مہربان کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔ یہ صاحب پاکپتن میں ہمارے میزبان تھے۔ یہ تھا ''فکرِ پرویز'' سے ہمارا پہلا تعارف۔ عہدِ طفولیت میں بھلا ہمیں اس ''فرقے'' سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی، تاہم تجسس کا پہلا بیج اسی دن بو یا گیا۔ کئی سال گزر گئے، لیکن نہ جانے کیوں متذکرہ نیم طنزیہ تعارفی جملہ ہمیں بھولا نہیں، تا آنکہ ہمیں دسویں جماعت میں ایک بزرگ استاد کے روبرو زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا موقع ملا۔ رحیم بھٹہ صاحب اس ہستی کا اسم گرامی ہے۔ جواب کافی معمر ہو چکے ہیں۔ ''جماعت احمدیہ'' کے برگزیدوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ہمیں رحیم صاحب کے بے حد احترام کے باوجود ان کے مذہبی اعتقادات سے اتفاق نہیں ہے۔ ان کے متعلق اور کیا کہیں بس غالبؔ کا یہ شعر عرض کر سکتے ہیں ؎

مانا کہ اِک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے　　لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں

اس عاجز پر رحیم صاحب کے لاتعداد احسانات میں سے سرفہرست یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں ''فکر پرویز'' سے باقاعدہ متعارف کروایا۔ ان کی وساطت سے ہی غلام احمد پرویز کی تصنیف ''قتلِ مرتد'' ہمیں ملی۔ میٹرک کا سٹوڈنٹ ایک علمی کتاب سے جتنا استفادہ کر سکتا ہے، ہم نے بھی کیا۔ آپ اس سے اندازہ کر لیں کہ کم و بیش ربع صدی گزر جانے کے باوصف نہ صرف اس کتاب کے مندرجات ہمیں اچھی طرح یاد ہیں بلکہ اس حوالے سے پرویز صاحب کے مثبت نقطۂ نظر نے مستقل ہمارے قلب و ذہن میں جگہ بنا لی۔ بعد میں ایسی کئی تقریریں اور تحریریں ہماری سماعتوں اور بصارتوں سے ٹکرائیں جن میں ارتداد کو جرم ثابت کرنے کے لئے بعض روایتی سوچ رکھنے والوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا، لیکن سچی بات ہے ان کی ایک بات بھی دل کو نہ لگی۔ اسی طرح غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق پرویز صاحب نے جو صراحت

> ان کی آخری آرامگاہ تیار ہو چکی تھی، پاس چارپائی پر ان کی میت پڑی تھی۔ قریب ہی جناب حنیف رامے نے اپنی چادر بچھا دی۔ ہم لوگ ان کے کہنے پر وہاں بیٹھ گئے۔

کی' وہ اتنی معقول ہے کہ اس کا ہر جواب پوچ ہے۔ بعض علمی مجالس میں ہم نے ''رسک'' لے کر اس باب میں بعض ثقہ علماء کرام سے براہ راست استفسارات کر کے بھی دیکھ لیا' لیکن جواباً ہمیں قابل رحم عجز کا مشاہدہ ہی کرنا پڑا اور ہم سوچتے ہی رہ گئے کہ محض ایک شخص کی معاندت اور غیر مستند تاریخ و روایات کی صنم پرستی نے انہیں کیسے دن دکھا دیئے ہیں کہ کائنات کی پاکیزہ ترین شخصیت ﷺ کا تقدس بھی انہیں عزیز نہیں رہا کہ بلا جھجک زبان پر ایسی ناروا باتیں لے آتے ہیں کہ حضور ﷺ سے محبت رکھنے والے ایک عام اور گنہگار مسلمان کی روح بھی کانپ اٹھتی ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انہیں راستی کا راستہ دکھائے۔

قصہ مختصر علم و ادب سے وابستگی جیسے جیسے پختگی کے مراحل طے کرتی گئی غلام احمد پرویز مرحوم کی تصانیف کا مطالعہ جاری رہا۔ اگرچہ اس دوران میں کئی پڑاؤ آئے' طویل وقفے بھی آئے۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار　　　لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

1983-85ء کا عرصہ بی۔اے کے طالب علم کی حیثیت سے ایف سی کالج میں گزرا۔ ہوسٹل میں مقیم رہے۔ اچھی طرح معلوم تھا کہ 25/B گلبرگ 2۔ پرویز صاحب کی رہائش ہے۔ یہ بھی خبر تھی کہ آپ ہر ہفتے درس قرآن دیتے ہیں۔ ''ثواب طاعت و زہد'' جاننے کے علی الرغم جانے کیوں طبیعت ادھر نہیں آئی۔ تعلق خاطر جانے کس کس نوع کے دار و رسن کی اور لئے پھرا بس ادھر رخ نہ ہو سکا ''ورنہ قریب تر تھا شبستاں کھلا ہوا''۔ حقیقت یہ ہے سب سے بڑی نعمت' نعمت کی موجودگی کا احساس ہے اور ہمیں بھی اس نعمت کا احساس اس دن ہوا جب یہ نعمت روئے ارض پر موجود نہ رہی۔ ایک دم قدرت اللہ شہاب کے افسانے ''چندراوتی'' کا پہلا فقرہ یاد آیا ہے:

''جب مجھے چندراوتی سے محبت شروع ہوئی۔ اسے مرے ہوئے تیسرا روز تھا......''۔

صاحبو! ہم وہ تاریخی دن کیسے بھول سکتے ہیں' جی ہاں 25 فروری 1985ء ہم اپنے کزن سے ملنے ایف۔سی کالج سے ریواز گارڈن گئے۔ واضح رہے ان دنوں ہمارے پاس ایگل کی بائیسکل ہوا کرتی تھی اور پورا لاہور اس کے دو پہیوں کی گردش میں سمٹنے پر مجبور بلکہ ''مجبورِ محض'' تھا۔ وہیں ریواز گارڈن میں اخبار کے پہلے صفحے پر ہماری نظر پڑی' پرویز صاحب کے سانحہ ارتحال کی خبر نے بے کل کر دیا۔ ان کی موت سے زیادہ افسوس ہمیں یہ لاحق ہو گیا کہ اتنا قریب ہونے کے باوجود ان سے مل نہیں سکے' انہیں سن نہیں سکے' ان کی زیارت نہیں کر سکے۔ اسی تاسف نے جسم و جاں میں ایک عجیب سی توانائی بھر دی' اپنی سائیکل اٹھائی' ریواز گارڈن سے سیدھے 25/B گلبرگ پہنچے۔ سفر آخرت کی تیاریاں ہو چکی تھیں۔ پرویز صاحب ایک چار پائی پر پڑے ابدی نیند سو رہے تھے۔ ان سے محبت کرنے والے ان گنت احباب ارد گرد موجود تھے' کہیں آنسو رواں ہیں' کہیں دبی دبی سسکیاں تو کہیں قدرے بلند آواز میں گریہ۔ پرویز صاحب کے بھائی (مرحوم) ڈاکٹر عارف بٹالوی سب کو تسلیاں بھی دیتے جاتے تھے اور خود روتے بھی جا رہے تھے۔ ہم نے بار بار جی بھر کے اس عظیم انسان کو دیکھا جس نے ایک عہد کو متاثر کیا تھا۔ برآمدے میں ایک عمر رسیدہ شخص اونچی آواز میں اپنے محسن پرویز صاحب کو یاد کر رہا تھا۔ اس کا نام مرزا

سلطان بیگ (نظام دین) تھا۔ جنازہ روانہ ہوا۔ ہم بھی اس جلوس میں شامل رہے۔ منی مارکیٹ کی گراؤنڈ میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ تدفین کا مرحلہ آیا تو بھی ہم موجود رہے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے ان کے کسی عزیز نے دور سے (غالباً کراچی سے) پہنچنا تھا' چنانچہ تدفین کے مرحلے کو کچھ مؤخر کر دیا گیا کہ فلائٹ کا انتظار کیا جانے لگا۔ اس دوران میں کہ ان کی آخری آرامگاہ تیار ہو چکی تھی' پاس چارپائی پر ان کی میت پڑی تھی۔ قریب ہی جناب حنیف رامے نے اپنی چادر بچھا دی۔ ہم لوگ ان کے کہنے پر وہاں بیٹھ گئے۔ ان دنوں رامے صاحب کا ایک مضمون جو روزنامہ ''جنگ'' میں چھپا تھا' بے حد متنازع ہونے کی وجہ سے ہر حلقے میں موضوع گفتگو بنا ہوا تھا۔ اس خاکسار نے اس مضمون کی بابت رامے صاحب سے جو دو ایک سوالات پوچھے تو اچھی خاصی محفل جم گئی۔ بڑی گرما گرم باتیں ہوئیں۔ واپس آ کر اس گفتگو کے تضمنات پر مبنی اور پرویز صاحب کے آخری سفر کی روداد' جو دس بارہ صفحات پر مشتمل تھی' ہم نے رحیم صاحب کو خط کی صورت میں بھیجی تھی' کیا عجب ان کے پاس یہ مفصل خط محفوظ ہو۔

بہرنوع وقت کا دریا اپنے غیر متعین تعینات کے ساتھ بہتا رہا۔ ہم ''طلوع اسلام'' کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتے رہے۔ ایک آدھ کنونشن میں شریک ہونے کی سعادت بھی ملی۔ کبھی کبھار پرویز صاحب کی کسی کتاب میں سے بھی گزرنے کا موقع ملتا رہا۔ ''فکر پرویز'' سے تعلق رکھنے والے دوستوں' اسلم صابر صاحب' محمود الحسن صاحب اور دیگر منسلکین سے رابطے رہے' مکالمات کا تبادلہ ہوتا رہا' ذہنی افق پھیلتا رہا۔ لیکن حق یہ ہے کہ پرویز کو پڑھنے اور سمجھنے کا حق ابھی ادا نہیں ہوا تھا۔ اب سے کوئی تین سال قبل کی بات ہے کہ یہ عاجز بسلسلہ ملازمت ساہیوال میں مقیم تھا۔ وضاحت کر دیں کہ ہمارا تعلق شعبہ تدریس سے ہے۔ کوئی 15/16 سال ہو گئے ہیں' مختلف کالجوں میں پڑھاتے ہوئے۔ 2001ء میں جب ڈسٹرکٹ گورنمنٹس کا ڈول ڈالا گیا تو ہماری رضا معلوم کیئے بغیر ''جبراً''، ہمیں کلاس روم سے اٹھا کر آفس میں بھیج دیا گیا۔ ممکن ہے عامیوں کی نگاہ میں ''ڈائریکٹر کالجز'' ہونا عزت کی بات ہو پر ہمیں تو یہ سراسر قید بامشقت کے مشابہ عمل محسوس ہوا۔ لہٰذا دو اڑھائی سال مسلسل سفارشیں ڈھونڈتے رہے کہ کوئی ''رجل غیب'' ہمیں اس جھنجٹ سے نجات دلا دے' ہم باز آئے اس ''ایجوکیشن افسری'' سے۔ سیدھی سی بات ہے ہم تو انہیں لفظ و حرف ہی ماننے کو تیار نہیں جو لٹریچر (علم و ادب) سے واسطہ نہ رکھتے ہوں اور یہاں تو اعداد تھے' ہندسے تھے' لایعنی میٹنگز تھیں' انکوائریاں تھیں ٹیکنیکل انسپیکشنز تھیں' فزیبلٹی رپورٹس تھیں' Expenditure State Ments تھیں' آڈٹ تھے' جی حضوری کی ایک زنجیر تھی۔ دستور یہی تھا کہ اوپر والوں کی ہر نامعقول بات ہنسی خوشی سہو اور نیچے والوں پر خوب خوب رعب گانٹھو۔ کیا عرض کریں اس افسری لائن میں تلخیاں ہی تلخیاں تھیں' چنانچہ اب بھی یہ

> یہ خاکسار عربی' فارسی' انگریزی اور اردو کے بہت بڑے عالم پرویز کو اپنا محسن کیوں نہ قرار دے کہ ہمیں موت کی وادی سے بچانے والا یہ واحد بندہ ہے۔ بات جسمانی موت کی نہیں' مسئلہ ذہنی موت کا ہے۔ ہمیں پرویز نے ذہنی موت سے بچایا ہے

گنگناتے رہتے ہیں'' ''جنہیں ہم بھولنا چاہیں وہ ''افسر'' یاد آتے ہیں۔''

خیر وہ جسے Good out of Evil کہتے ہیں۔ اس کی رو سے مذکورہ اذیت بلکہ ''شر'' میں سے ہمیں بھی خیر کے کچھ پہلو ضرور ملے۔ میر دردؔ نے کیا عمدہ شعر کہا ہے ۔

خیر و شر کو سمجھ کہ ہیں دو زہر — سانپ کی زیست ہی تجھے سم ہے

یہ درست کہ لمحۂ موجود میں ہم آزاد ہیں، اس ''سمناک'' ماحول سے ہمیں چھٹکارا مل چکا ہے لیکن یہ بہت بڑا سچ ہے کہ اگر اس Misery کا ہمیں ذاتی طور پر تجربہ نہ ہوا ہوتا، زندگی کی سفاک جہتوں کے ہم خود شاہد نہ ہوتے تو ممکن ہے پرویز صاحب کی تصانیف میں موجود ''زندگی کے زہر'' کو نوشِ جاں کرنے کی صلاحیت سے عاری رہتے۔ وہی بات ۔

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی، نہ طُور پر — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

صاحبو! آپ ذرا سوچیے وہ فرد جس نے چالیس برس مذہبی گھرانے، مذہبی معاشرے میں بتائے ہوں کیا وہ مذہب کے بغیر لقمہ بھی توڑ سکتا ہے؟ نہیں جناب یہ قریب قریب ناممکن ہے۔ اس فرد کے طرزِ احساس کی بُنت میں مذہب کا Fibre بنیادی تانے بانے کے طور پر شامل ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر اتفاق سے کوئی ایسا واقعہ اس فرد کے ساتھ پیش آجائے کہ اسے ''بدنصیبی'' سے اپنے مخصوص مذہبی نظریات کو خالص معروضیات کی دھوپ میں کھینچنا پڑ جائے، غیر جانبدار ہو کر ان کا جائزہ لینا پڑ جائے، ہر خوش عقیدگی کو منہا کر کے ان کا تجزیہ کرنا پڑ جائے تو عین ممکن ہے نتائج کی بے رحم صورت دیکھ کر اس فرد کو ہارٹ اٹیک آجائے اور وہ سچائی کی تاب نہ لا کر اس دنیا سے ہی کوچ کر جائے۔

دوستو! یہ خاکسار عربی، فارسی، انگریزی اور اردو کے بہت بڑے عالم پرویز کو اپنا محسن کیوں نہ قرار دے کہ ہمیں موت کی وادی سے بچانے والا یہ واحد بندہ ہے۔ بات جسمانی موت کی نہیں، مسئلہ ذہنی موت کا ہے۔ ہمیں پرویز نے ذہنی موت سے بچایا ہے۔ خوش قسمت ہے وہ انسان جو ذہنی موت سے قبل جسمانی طور پر مر جائے اور بدقسمت ہے وہ انسان جو ذہنی موت کے بعد جسمانی سطح پر زندہ رہے۔ کوئی اس عذاب کو کیا سمجھ سکتا ہے۔

دفتری زندگی کے دوران ایک مرتبہ نہیں ان گنت مرتبہ ایسا ہوا کہ زندگی بغیر کسی آراستگی کے، بغیر کسی ورق کے، ہر Drapery سے مکمل بے نیاز سامنے آتی رہی۔ ایسے لمحے بار بار آئے کہ غیبی قوتوں کی اشد ضرورت محسوس ہوئی، لیکن یہ کیا کہ Stretch the Truth والا فارمولا بلکہ مجرب نسخہ بھی آزما کر دیکھ لیا، پر ہوا کچھ نہیں، جو زمینی حقائق تھے، وہ جوں کے توں رہے، جو سچ تھا، وہ وہی رہا۔ اسباب کا جادو ہی سر چڑھ کے بولا، علت اور معلول کے پیچ رشتے کی توانائی اس شدت سے ابھر کر سامنے آئی کہ I was Stumped.

طاقچے کے خطوط پڑھتے پڑھاتے عمر بیت گئی تھی، کچھ پلے نہیں پڑا تھا، یہ پرویز ہی تھا جس نے اقبال کے یہ شعر یوں سمجھائے کہ ہمیں ''کلیاتِ اقبال'' میں انہیں اس نیت سے تلاش کرنا پڑا، کہیں یہ اشعار پرویز نے خود گھڑ کر تو اقبال سے

منسوب نہیں کر دیئے، آپ بھی سنئے ۔

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی — مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری — مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

جی ہاں صاحبو! یہ پرویز صاحب کی ''کتاب التقدیر'' تھی جس کے بالاستعیاب مطالعہ نے وہ گرہ کھول دی جو ذہن میں بیس برس سے پڑی ہوئی تھی، کس کس نکتہ ورکی بارگاہ میں ناصیہ فرسائی نہیں کی تھی ہر کہیں سے ایک سا ہی جواب موصول ہوا تھا۔ ''نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی''۔ اس معرکہ آرا کتاب کے مطالعہ کے بعد سب سے پہلے تو اپنے اللہ سے ہاتھ باندھ کر معافی مانگی کہ یارب الارباب! اس عاصی کو معاف کر دے کہ اب تک اپنا ہر جرم تیرے کھاتے میں ڈالتا آیا ہوں۔ تیرے قادر ہونے کا مفہوم اصفیاء و علماء نے مجھے یہی سمجھایا تھا کہ گناہ کی توفیق بھی تو دیتا ہے، نیکی کی سعادت بھی تو ہی بخشتا ہے۔ گمراہ بھی تو کرتا ہے، ہدایت کے جادے پر بھی تو ہی گامزن کرتا ہے۔ بندہ مجبور ہے، تیرے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ہے، مختاری کی تہمت سے متہم ......لیکن یہ پرویز تھا جس نے قرآن کھول کر دکھایا کہ نہیں نہیں یہ پاک خدا پر الزام ہے، اس نے تو ہر انسان کو مکمل اختیار دیا ہوا ہے اور پھر اس نے وہ آیات ایک ایک کر کے سمجھائیں جن میں تضاد محسوس ہوتا تھا، جو خدا کو غیر عادل ثابت کرتی تھیں، بے انصاف بتاتی تھیں۔ بندے کو مجبور صورت میں پیش کرتی تھیں۔ جب سارے عقدے کھل گئے تو زبان اپنے آپ یہ تلاوت کرنے لگی ۔

> یہ جری شخص غلام احمد پرویز تھا جس نے قرآن کی رو سے توضیح کی، ختم نبوت کا مطلب ہے، حضور ﷺ ہر لحاظ سے آخری نبی ہیں۔ اب ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، پرانا نہ نیا

نہ یہ تقدیر کا لکھا تھا نہ منشائے خدا — حادثے مجھ پہ جو گزرے مرے حالات میں تھے

ضمناً پرویز صاحب نے ہی وضاحت کی، قرآن مجید کی کوئی آیت تو دور کی بات ہے، ایک نقطہ، شعشہ تک بھی منسوخ نہیں۔ ورنہ بڑے بڑے زہاد پانچ سات آیتوں کے سامنے دم بخود یہ اقرار کرتے پائے گئے: اے آیتو! تم پر تو عمل نہیں ہو سکتا۔

سبحان اللہ یہ کریڈٹ اس پرویز کے کھاتے میں ہی لکھا جائے گا جسے سارے علماء صبح و شام کافر کافر کہتے نہیں تھکتے۔ آپ یقین کیجئے مسئلہ تقدیر سمجھ میں آنے کے بعد اس عاجز کو وہی لذت محسوس ہوئی جو پوری تحقیق کے بعد کسی نومسلم کو قبول اسلام کی ملکوتی ساعت میں محسوس ہوتی ہوگی۔

غلام احمد پرویز کا دوسرا بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے ختم نبوت کا حقیقی مفہوم سمجھایا تفصیل پھر کبھی سہی، اجمالاً اتنا عرض ہے کہ احمدیوں کے ساتھ ہمارا بڑا وقت گزرا ہے۔ ہم نے ان لوگوں کو مجموعی طور پر اچھے کردار والے انسان پایا ہے، شرافت اور علم تقریباً ہر احمدی کے امتیازی اوصاف ہیں کہ ان کی جماعت منظم ہے، تربیتی نظام مثالی ہے لیکن ان لوگوں کے اعتقادات ریت

کی دیوار ہیں۔ ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب کیوں معروضی بنیادوں پر اپنا جائزہ نہیں لیتے؟ ہم اپنے طور پر اس کی دو وجوہ تلاش کر سکے ہیں۔ پہلی یہ کہ ہمارے علماء نے اس جماعت کے خلاف نفرت کی ایسی فضا تیار کی ہے کہ یہ لوگ اپنے کمزور عقیدوں کے ساتھ اور زیادہ مضبوطی سے جڑ گئے ہیں۔ اگر انہیں پیار کے ساتھ بات سمجھانے کی کوشش کی جاتی تو آج نتائج یکسر مختلف ہوتے۔ دوسری بات بھی خاص اہمیت کی حامل ہے کہ ختم نبوت کے باب میں عام مسلمانوں کا قریب قریب وہی موقف ہے جو خود قادیانیوں کا ہے۔ جی ہاں ایک آنے والے کا عقیدہ مسلمانوں کی میراث ہے۔ ''ہم نے احمدی علماء VS علمائے اسلام'' کافی مناظرے سنے ہیں۔ ہمیشہ یہی دیکھا کہ عام سے احمدی نے بھی اچھے بھلے عالم دین کو وہ عبارات دکھا کر لاجواب کر دیا جن میں غیر تشریعی نبوت کے اجرا کو ہمارے اکابرین نے تسلیم کیا ہے۔ اب یہ اکابرین عامی شامی نہیں، جید ہستیاں ہیں۔ اس نازک صورتحال میں علماء کرام اسی معروف تاویل کا سہارا لیتے ہیں کہ غیر تشریعی نبی سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت ہے وہ چونکہ آسمانوں پر زندہ موجود ہیں، آخری زمانے میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کے لئے تشریف لائیں گے۔ اس پر ذہین احمدی فوراً یوں گرفت کرتے ہیں۔ جناب! اصل چیز پھر ''ضرورت نبوت'' ہوئی۔ اگر تجدید و احیائے دین کے لئے پرانا نبی آ سکتا ہے تو نیا کیوں نہیں؟ اور پھر وہ نیا جو قرآن کو منسوخ کرنے والا نہ ہو، حضور ﷺ کا امتی ہو۔ نیز ختم نبوت کے پھر معانی یہی ہوئے کہ حضور ﷺ فضیلت کے اعتبار سے سب سے بلند درجہ نبی ہیں، آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی پیروی میں کوئی نبی مبعوث ہو جائے تو آپ ﷺ کی ختمیت مرتبی متاثر نہیں ہوتی جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کی آمد نو کے بعد متاثر نہیں ہوگی کیونکہ وہ اللہ کے نبی ہوں گے اور مسلم شریف کی احادیث کے مطابق ان پر وحی بھی اترے گی۔

دوستو! یہ جری شخص غلام احمد پرویز تھا جس نے قرآن کی رو سے توضیح کی، ختم نبوت کا مطلب ہے، حضورؐ ہر لحاظ سے آخری نبی ہیں۔ اب ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، پرانا نہ نیا۔ قرآن بار بار شہادت دیتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام بھی اسی طرح وفات پا چکے ہیں جس طرح تمام انبیاء کرام رحلت فرما گئے ہیں۔ چنانچہ اب کسی کی آمد کا سرے سے کوئی سوال ہی نہیں کیونکہ ختم نبوت کا مطلب ''ضرورتِ نبوت'' کا خاتمہ ہے۔ اب ہدایت کا سرچشمہ صرف اور صرف قرآن ہے، کوئی نئی وحی نہیں، حتیٰ کہ کسی مترادف نام و متبادل عنوان سے بھی اللہ کا کلام کسی بندے پر نازل نہیں ہوگا، کیونکہ اللہ کا کلام حجت ہوتا ہے، اب قرآن کے بعد جو اس حجت کو بیچ میں لائے گا، وہ امت کو نئی تقسیم سے دوچار کرے گا۔

ویسے جملہ معترضہ کے طور پر ذرا غور کیجئے کہ احمدیوں کا مسئلہ سلجھانا کتنا آسان تھا یہ لوگ وفات مسیح کے پہلے ہی قائل ہیں۔ انہیں صرف خاتم النبین کا مفہوم سمجھانے کی ضرورت تھی۔ انہیں بتایا جاتا کہ آیات روایات پر مقدم ہیں۔ جب آیات یہ اصولی فیصلہ دے رہی ہیں کہ نئی نبوت ممکن ہی نہیں تو آپ اس فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کر دیں، کسی اور طرف آپ کو دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ واضح سی بات ہے کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ قول رسول ﷺ اور آیت ربانی میں تناقض ہو۔ جب اللہ کی کتاب

کہہ رہی ہے حضور ﷺ آخری نبی ہیں اور حضرت عیسیٰؑ وفات پا چکے ہیں تو پھر حضور ﷺ کا نقطہ نظر اس سے ہٹ کر کیسے ہوسکتا ہے؟ نتیجہ معلوم! دیکھنے والی چیز یہ ہے کہ از سر نو جائزہ لیا جائے وہ فرامین جو حضور ﷺ سے منسوب کئے جا رہے ہیں کیا وہ حضور ﷺ کے ارشادات ہیں بھی یا نہیں؟ پرویز صاحب نے ہی قوم کو سمجھایا کہ حدیث رسولؐ رہنمائی کا بلاشبہ سرچشمہ ہے لیکن یہ طے ہونا ازبس ناگزیر ہے کہ جسے حدیث رسول ﷺ کہا جا رہا ہے وہ حدیث رسولؐ ہے بھی یا نہیں؟ اور ساتھ ہی انہوں نے بہترین معیار بھی مقرر کر دیا ہے کہ جو قول قرآن کے مطابق ہے وہ قول رسولؐ ہے جو اس کے برعکس ہے وہ قول رسول ﷺ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس تناظر میں پرویز کو منکر حدیث کہنا سراسر ناانصافی ہے یا نہیں؟

غلام احمد پرویز کی علمی خدمات کا مختصر جائزہ بھی کئی جلدوں کی کتاب میں لیا جا سکتا ہے۔ وقت آئے گا ان پر بڑی بڑی یونیورسٹیاں تحقیقی مقالے لکھوائیں گی، تب امت مسلمہ کو معلوم ہوگا کہ کتنا بڑا شخص ان میں ہو گزرا ہے۔ ایسا شخص جس نے مدت العمر قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ سے ایسا عدیم النظیر عشق کیا کہ واقعتاً دور دور تک مثال دکھائی نہیں دیتی۔ پچاس سے زائد تصانیف چھوڑ کر جانے والے پرویز نے کہیں نہیں کہا کہ میرا کہا حرفِ آخر ہے۔ انہوں نے عمر بھر عجز و انکسار کی ردا اوڑھے رکھی اور یہی کہتے رہے کہ میں قرآن کا معمولی طالب علم ہوں، جس طرح مجھے سمجھ آئی، خلوصِ نیت سے اسی طرح آگے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ یہی بنیادی وجہ ہے کہ اتنا اہم علمی خزینہ تخلیق کرنے والے پرویز نے کسی فرقے کی بنا نہیں رکھی۔ ان کی جماعت وہی تھی جو رسول کریم ﷺ کی جماعت تھی۔ ظاہر ہے اللہ کے نبی نے اپنی امت کو فرقوں میں بانٹنا تو درکنار دیکھنا بھی پسند نہیں کیا، اسی لئے پرویز صاحب نے بھی علامہ اقبال کی طرح بس ایک فکر دی ہے، اب اس نابغہ عصر کی فکر سے پوری کی پوری امت کتنا نور کشید کرتی ہے، یہ اس پر منحصر ہے۔ انہوں نے شروع سے لے کر آخر تک قرآن مجید کی شرح اپنی ضخیم تصانیف میں محفوظ کر دی ہے۔ جو ایک مربوط نظام فکر سے بجا طور پر معنون کی جا سکتی ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ روشنی کے اس مینار سے استفادہ کرتے ہوئے اس قرآنی معاشرے کی تشکیل کریں جس میں مسرتیں ہوں، بدعنوانیاں نہ ہوں، محبتیں ہوں، خوشحالیاں ہوں، انسانی ذوات نشوونما پائیں، امن ہو، فساد نہ ہو، افلاس کا عذاب نہ ہو۔ سب اپنے سوہنے اللہ کے قوانین کی اطاعت کریں اور اس کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنا ہی پیار کریں جتنا ان کی خوبصورت ذات سے ان کے دوستوں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علی مرتضیٰؓ اور دیگر مخلص احباب رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو تھا۔

> ایسا شخص جس نے مدت العمر قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ سے ایسا عدیم النظیر عشق کیا کہ واقعتاً دور دور تک مثال دکھائی نہیں دیتی۔ پچاس سے زائد تصانیف چھوڑ کر جانے والے پرویز نے کہیں نہیں کہا کہ میرا کہا حرفِ آخر ہے

☆......☆......☆

پرویز علیہ الرحمۃ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

درسِ قرآن

سورۃ الرعد آیات 3 تا 6

وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ
اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝٣ وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ
وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۣ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا
عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝٤ وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا
تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ
وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝٥ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ
مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ
الْعِقَابِ ۝٦

عزیزانِ من! آج اگست 1974ء کی 25 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الرعد کی یوں کہیے تیسری آیت سے ہوگا۔ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ پچھلے درس میں اسی سورت کی دوسری آیت زیرِ نظر تھی لیکن اس کا آخری حصہ وہ میں نے اس درس پر ملتوی کر دیا تھا کہ اس میں بات ایک اہم آ رہی تھی اور وقت اُس درس میں باقی نہیں رہا تھا۔

سماء اور ارض کا لغوی مفہوم:

دوسری آیت میں آپ دیکھیں گے کہ قرآنِ کریم نے مظاہرِ فطرت پر غور و فکر کی تلقین کی ہے۔ میں دہرا دوں جو اس نے کہا ہے کہ ان آسمانی فضاؤں کے اندر آپ دیکھ رہے ہیں۔ یاد رکھئے! جسے قرآن سما یا سماوات کہتا ہے وہ ہمارے تصور میں یہ نیلگوں فضا جو نظر آتی ہے یہ مراد نہیں ہوتی۔ اس کی تو کوئی حقیقت ہی نہیں ہے یہ تو صرف ہماری حدِ نگاہ ہے بلکہ وہ جو فضائی کرے یا جتنی بھی اجرامِ فلکی ہیں جو کچھ بھی اس فضا کی پہنائیوں میں بلندیوں میں (سما بلندی کو کہتے ہیں) جو کچھ بھی ہے اس سب کو قرآن سما کہہ کر پکارتا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں ارض کہتا ہے ارض کے معنی ہوتے ہیں جو چیز نیچے واقع ہو۔ اور سما ہوتی ہے جو اوپر واقع ہو۔ اور قرآن کا اعجاز ہے اور کون کون سا اعجاز نہیں ہے میں کہتا ہوں یہ چیزیں ہیں جن سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ آج سے تیرہ سو سال پہلے کا تو کوئی فلاسفر اور کوئی حکیم اور سائنٹسٹ بھی یہ باتیں نہیں جانتا تھا کہہ نہیں سکتا تھا

حالانکہ سائنس کی کتاب نہیں ہے اس کا منتہا مقصود اور ہے۔ ضمناً جو بھی اس میں آ جاتی ہے وہ تو REALITY (حقیقت) کے خلاف ہو نہیں سکتی۔ سما اور یہ ارض کا لفظ جو ہے آپ دیکھئے کہ بظاہر ہم بھی آج اسی کو زمین کہتے ہیں یہ جو ہماری زمین ہے جسے ہم ارض کہتے ہیں کسی اور کو ہم ارض نہیں کہتے اور یہ جو ہیں آسمانی کرے اس کو ہم سما کہتے ہیں لیکن قرآنِ کریم ایک مقام پہ کہتا ہے کہ ہر سما کے مثل اس کی ارض ہے۔

صاحب! کتنی عظیم چیز ہے۔ یہ سما اور ارض جو ہے یہ RELATIVE TERMS ہیں یہ اضافی TERMS ہیں۔ جب کہیں گے کوئی چیز اونچی تو وہ کسی سے اونچی ہوگی' نیچے اس سے نیچے ہوگی۔ تو یہ جتنے بھی فضا کے اندر یہ فضائی کرے جنہیں آپ کہتے ہیں اب دیکھئے! کس انداز سے بات اس نے کہی کہ ہر اونچا اوپر کا کرہ جو ہے اس کی نسبت سے جو دوسرا نیچے ہے وہ اس کی ارض ہے۔ تو اس کی رو سے صرف ایک ارض نہیں ہے ہر بلند کرے کے مقابلے میں جو اس سے پست کرہ ہے نیچے سمجھ لیجئے کرہ ہے اس کی ارض ہے ہر سما کے مثل اس کی ارض ہے۔ میں کہتا ہوں کبھی غور کیجئے اور کسی علم الافلاک کے ماہر سے کہیے کہ چودہ سو سال کا جتنا بھی فلکیات کا علم آپ کے سامنے ہے یہ چیز کہیں بھی آپ کو وہاں نظر آتی ہے کہ ہر سما کی ایک ارض ہے اور ہر ارض کی ایک سما ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ آج بھی ارض جو ہے وہ ہم اسی زمین کو کہتے ہیں۔ قرآن نے چودہ سو سال پہلے یہ بات کہی ہے کہ ٹھیک ہے تمہاری زمین' تمہارے اوپر جو کرے ہیں ان کی نسبت سے نیچے واقع ہوئی ہے لیکن یہ ایک ہی ارض نہیں ہے ہر سما کی ایک ارض ہوتی ہے ہر ارض کا ایک سما ہوتا ہے۔ صاحب! اس قرآن کی کیا بات ہے!

وحی کے ذریعے کو محسوس دیکھنے کی خواہش پر قرآن حکیم کا جواب:

خیر! تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ مظاہرِ فطرت کی طرف غور و تدبر کے لیے تلقین کر رہا ہے اور وہ کہہ یہ رہا ہے کہ تمہیں یہ بات ذہن میں نہیں آ رہی اس بات پہ تعجب آ رہا ہے کہ وحی ایک غیر محسوس ذریعۂ علم ہے محسوس طور پر تمہارے سامنے کیوں نہیں آتا۔ بار بار تم یہ کہتے ہو کہ ہم اس جبریل کو دیکھنا چاہتے ہیں اور فرشتے کو دیکھنا چاہتے ہیں معلوم کرنا چاہتے ہیں لکھی ہوئی کتاب ہونی چاہیے۔ دلیل یہ دی ہے کہ کیا یہ کلیہ ہے تمہارے سامنے کہ جو چیز تم آنکھوں سے نہ دیکھو اس کے متعلق کہو کہ وہ ہے ہی نہیں اور دلیل دی ہے باہر کی کہ تمہیں یہ شمس و قمر اور یہ کرے جو نظر آتے ہیں۔

یہ فضا کے اندر کہیں گڑے ہوئے ہیں' کوئی چیز ایسے فضا میں کھڑی ہو سکتی ہے کہ جس کے نیچے کوئی سہارا نہ ہو؟ ان کے نیچے کوئی سہارا تمہیں نظر آتا ہے؟ اور بغیر سہارے کے تو ہیں نہیں' یہ وہ سہارے ہیں جو تمہیں نظر نہیں آ سکتے لیکن سہارے ہیں۔ تو اگر محسوس کائنات کی یہ کیفیت ہے کہ اتنے اتنے بڑے سہارے تمہیں نہیں نظر آتے اس کے باوجود تم مانتے ہو کہ یہ کسی سہارے پہ ہی کھڑے ہیں بغیر سہارے کے اتنا بڑا کرہ جو ہے وہ کھڑا رہ سکتا ہے۔ ذرا سی اتنی سی کنکری تم فضا میں پھینکو بغیر سہارے کے کیسے نیچے آتی ہے اور یہ بغیر سہارے کے کھڑے ہیں بغیر سہارے کے نہیں ہیں سہارے ہیں جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے۔ تو اگر محسوس دنیا میں بھی یہ کیفیت ہے کہ جو چیزیں نظر نہ آئیں ان کے متعلق یہ کلیہ نہیں ہے کہ وہ ہیں ہی نہیں' انہیں ماننا

پڑتا ہے۔تو یہ دنیا جسے وحی کی دنیا کہا جاتا ہے یہ تو عالمِ محسوس سے بھی دوسری چیز ہے۔

کیا یہ کائنات ایک معین مدت تک کے لئے ہے لفظ معین کا لغوی مفہوم اجل ہے

تو یہ ساری چیزیں پہلی آیت میں آئیں ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ (13:2) کیا عجیب چیز ہے! شمس وقمر کی تسخیر ہے' پھر یہ چیز کہ یہ ابدی نہیں ہیں یہ ایک معین مدت کے لیے ہیں۔معین کا لفظ ہمارے ہاں ایسے نظر آتا ہے جیسے پہلے سے کسی چیز کے متعلق لکھ دیا گیا ہو' جو چیز قانون کے وارد ہونے والی ہو اس کو بھی یہ چیز اجل کہا جاتا ہے اس کے معنی اس معیاد کے ہیں۔گھڑی کو آپ چابی دیتے ہیں چوبیس گھنٹے جو ہیں یہ چوبیس گھنٹے اس کی اجل کہلاتی ہے۔

علامہ پرویز''قرآنِ حکیم کو پڑھانے والے مختلف شعبوں میں سپیشلسٹ ہونے چاہئیں'':

میں نے عرض کیا ہے کہ دراصل یہ نصاب کی کتاب ہے کلاس کے اندر پڑھانے کی کتاب ہے۔اور اس کے جتنے شعبے ہیں اس کو مختلف ماہرین پڑھائیں گے کسی ایک کے بس کی بات نہیں ہے' ایک ایک فن کے سپیشلسٹ ہونے چاہئیں جو اس کتاب کو پڑھائیں وہ تو ایک ایک لفظ ایسا ہے کہ آگے جا نہیں سکتا۔یُدَبِّرُ الْاَمْرَ (13:2) پھر جو چیز تمہیں محسوس نظر آتی ہے اس کے پیچھے پلاننگ کا زمانہ ایک ایسا ہوتا ہے

جسے تم دیکھ نہیں سکتے اور اصل چیز تو وہ چیز ہوتی ہے جس میں ان کی DIRECTION جو ہیں متعین کی جاتی ہیں۔بہر حال یہ آیات جو ہیں ان کو ہم نکھار کر ابھار کر بیان کرتے ہیں۔اور بات جو میں نے چھوڑی تھی یہ کہ لَعَلَّکُمْ کاہے کے لیے یہ کچھ کرتے ہیں؟ میں نے کہا تھا کہ یہ لَعَلَّکُمْ بڑی اہم چیز ہے''تا کہ یہ ہو'' یعنی یہ سب کچھ پیچھے سے جو بیان کیا ہے وہ بیان کرنا مقصود بالذات نہیں ہے' یہ اس کے لیے جو آگے کہا جاتا ہے۔

مذہب کی دنیا میں تو عقل وفکر کا کوئی دخل ہی نہیں ہوتا:

میں نے کہا ہے کہ عام طور پہ مذہب کے معاملے میں وہ عقل کو اور REASON کو دخل نہیں ہے۔لَعَلَّکُمْ (13:2) تو خاص REASON کی چیز ہے''تا کہ یہ ہو''۔''تا کہ'' ہی تو LOGIC کی بنیاد ہوتی ہے لیکن REASON یا LOGIC اس صورت میں بنتا ہے کہ وہ جو''تا کہ'' کا بعد کہا گیا ہے وہ واقعی جو پیچھے کہا گیا ہے وہ اس کا نتیجہ ہو۔اگر کوئی یہ چیز کہے کہ صاحب! تم پانی پیؤ تا کہ تمہارا دوست آجائے تو پوچھیں گے کہ صاحب! ان دو کڑیوں میں ربط کیا ہے۔اگر تم کہتے کہ صاحب! خط لکھو' تار دو' ٹیلیفون کرو تا کہ تمہارا بھائی آجائے' ان میں ربط ہے۔

Logic یا Reason کے فلسفے کی اہمیت اور اس کی وضاحت:

میں مثالوں سے یہ چیزیں واضح کرتا ہوں ورنہ یہ بھی ایک الگ علم ہے LOGIC ہے۔یہ کرو تا کہ یہ ہو جائے۔اب

یہاں لَعَلَّکُمۡ آیا ہے ''تا کہ یہ ہوجائے'' تونظر آتا ہے کہ جو کچھ پیچھے کہا گیا ہے وہ اس لیے ہے تا کہ یہ بات ہو وہ بات آگے کیا بتائی ہے؟ کارگہ کائنات کے اوپر غور وفکر کرو دیکھو سوچو تا کہ لَعَلَّکُمۡ بِلِقَآءِ رَبِّکُمۡ تُوۡقِنُوۡنَ (13:2) عام ترجمے آپ کو یہ ملیں گے ''تا کہ تمہیں اپنے رب کی ملاقات کا یقین ہوجائے''۔ صاحب! یہ کیسے یہ بات ہوئی؟ یعنی ان پہ غور وفکر کرو تا کہ خدا سے ملاقات کا یقین ہوجائے۔ اور پھر جب لفظ ملاقات ہمارے ہاں آجائے گا تو وہ ملاقات تو ہم جانتے ہیں۔ دونوں کڑیوں میں ربط نظر نہیں آتا اگر آپ ملاقات کا لفظ لے لیں گے۔

وہ تو یوں ہے کہ جیسے اس جنگل میں چلو پھر وادھر اُدھر جاؤ وہاں دیکھو تو سہی وہاں تمہارا جو کھو گیا ہوا دوست ہے اس سے تمہاری ملاقات ہوجائے گی۔ تو اس کائنات کی پہنائیوں میں ان چیزوں کے اندر جاؤ کہیں غور وفکر کرو ڈھونڈو تلاش کرو تا کہ خدا سے تمہاری ملاقات ہوجائے۔ وہ خدا جس کے متعلق وہ یہ کہہ رہا ہے کہ لَا تُدۡرِکُہُ الۡاَبۡصَارُ (6:103) تمہاری نگاہیں تمہاری آنکھیں اسے پا نہیں سکتی۔ ہماری آنکھیں تو محسوس شے کو پاسکتی ہیں حالانکہ اس خدا کے متعلق کہا یہ گیا ہے وَهُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ (57:4) تم جہاں ہو خدا تمہارے ساتھ ہے فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ (2:115) جدھر بھی نگاہ اٹھا کر دیکھو گے خدا نظر آئے گا۔

قرآنی الفاظ کا اپنی کسی زبان میں ترجمہ قرآنی تصورات کو مسخ کر دیتا ہے جبکہ لفظ لقاء کا مفہوم بھی قابل غور ہے:

تو جس کی کیفیت یہ ہے کہ: وَنَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ (50:16) وہ رگِ جان سے بھی قریب ہے اس سے ملاقات کے لیے کہنا کہ جاؤ ان جنگلوں میں ان پہاڑوں میں ان وادیوں میں ان دریاؤں میں تا کہ اس سے تمہاری کہیں ملاقات ہوجائے اور پھر ملاقات کی نفی کی ہے لَا تُدۡرِکُہُ الۡاَبۡصَارُ (6:103)۔

مثال کے طور پہ جیسے ہم کہتے ہیں کہ اگر وہ کہیں کھڑا بھی ہو تمہارے سامنے تو تم تو دیکھ ہی نہیں سکتے اس کو۔ دیکھا آپ نے کہ ایک ترجمہ جو ہے ایک لفظ جس معنی میں ہماری زبان میں استعمال ہوتا ہے اس میں اگر وہ ترجمہ کر دیا جائے کتنی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ لفظِ ملاقات نے یہ سب چیز پیش کردی۔

لقاء آمنے سامنے کو ہی نہیں کہتے ہیں بلکہ ان کے ہاں تو ابتداً یہ چیز کسی چیز کو مس کر لینے کو بھی کہتے ہیں لیکن یہی معنی نہیں ہیں خود ان کے عربوں کے ہاں لغت کے اعتبار سے بھی یہی معنی نہیں۔ خود لغت کے اندر یہ چیز ہے کہ کسی شے کو نگاہِ بصیرت سے اس کا ادراک کر لینا جو ہے یہ بھی لقاء کہلاتا ہے۔ خدا کی جلوہ افروزیاں اس کی تخلیق کی نادرہ کاریاں غور وفکر کرو تا کہ یہ چیزیں ابھر کر نکھر کر سامنے آجائیں۔

قرآن حکیم میں خدا کی ذات کے متعلق صرف اللہ کا لفظ ہی استعمال ہوا ہے جبکہ باقی اس کی صفات ہیں

اور یہ دیکھئے! یہاں اللہ نہیں کہا ہے' اللہ کا لفظ خدا کی ذات کے لیے استعمال ہوتا ہے یہ باقی چیزیں جتنی بھی خدا کی صفات کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ بر بکم ہے ربوبیت اس کی جو ہے اس کا قانونِ ربوبیت ہے۔ اور قانونِ ربوبیت تو آپ کو معلوم ہے کہ کسی شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے اس کی پرورش کرتے ہوئے اس کی تکمیل تک لے جانا اسے ربوبیت کہا جاتا ہے۔ کائنات میں غور و فکر سے یہ چیز تمہارے سامنے آئے گی۔ اور ابھی آنے دیجئے اگلی آیات میں بتاتا ہے کہ ربوبیت کا قانون کیسا ہے' کس طرح کارفرما ہے۔

کائنات کی بلندیاں اور پستیوں میں خدائے علیم کا نظامِ ربوبیت واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے:

کہا کہ جاؤ اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں دیکھو جو چیزیں کارفرما ہیں ان پہ غور و فکر کرو اور وہاں تم اپنی آنکھوں سے خدا کے قانونِ ربوبیت کو مشہود دیکھ لو گے۔ یہیں یہ نہیں کہا اور مقامات میں بھی یہ کہا ہے۔ وہ مقام سامنے لانے سے پہلے میں یہ عرض کروں کہ یہ لفظ تو قنون جو ہے اس پہ اور غور کی چیز ہے۔ علم پہلی چیز ہوتی ہے وہاں تو یقین کہا ہے کہ تمہیں اس بات کا یقین آ جائے۔ یقین تو بہت بڑی حد ہے' علم کی بھی بہت اگلی حد ہے جسے ہم یقین کہتے ہیں۔ اسی لیے قرآن نے دوسرے مقام پہ یہ علم کے جو درجے گنائے ہیں علم الیقین کہا ہے وہ علم کہ جس سے یقین حاصل ہو جائے۔ یہ لقاء رب کا تمہیں یقین آ جائے۔

قرآن حکیم میں لفظ لقاء کا استعمال جو بڑا پُر معنی بھی ہے اور واضح بھی:

عزیزانِ من! یہ ہے جسے ہم نے صرف مذہب کی ایک کتاب بنا کے رکھ دیا۔ لقاء رب پہ تمہیں یقین آ جائے' جاؤ کائنات میں جا کے غور و فکر کرو تا کہ خدا کے قانونِ ربوبیت کے متعلق تمہیں یقین ہو جائے۔ کہیں یہ قرآنِ کریم نے لقاء کا لفظ مکافاتِ عمل کے لیے استعمال کیا ہے ''تمہارے اعمال کے نتائج محسوس شکل میں تمہارے سامنے آ جائیں خدا کے قانون کے مطابق'' اسے بھی لقاء کہا ہے۔ آمنا سامنا کسی کا کرنا جسے ہم اپنی زبان میں یوں کہتے ہیں۔ اعمال تو تیرِ جستہ ہوتا ہے تمہاری کمان سے نکل چکا ہوتا ہے جو تم کر چکتے ہو وہ تو پھر تمہارے سامنے آتا ہی نہیں ہے وہ غیر محسوس ہو جاتا ہے' کہیں جھوٹ بولا ہے اس کے بعد وہ جھوٹ کا کہیں وجود نظر نہیں آتا ہے۔ کہا کہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے اوپر یقین ہو تو تمہارا جھوٹ محسوس' مشہود شکل میں تمہارے سامنے آ جائے گا' خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین پیدا ہو جائے گا۔ اور یہاں رب ہے قرآن میں جہاں جہاں یہ لفظ لقاء آیا ہوا ن آیات میں آپ دیکھئے گا جو بھی صفتِ خداوندی وہاں بیان ہوگی اس کو مشہود شکل میں سامنے لانے کے لیے یہ لفظ استعمال ہوگا۔ اور جیسا میں نے عرض کیا ہے لغت میں راغب خود یہ لکھتا ہے کہ بصارت اور بصیرت دونوں سے کسی شے کو دیکھ لینا اس کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اور جو شے قرآن نے کہا ہے ابصار سے نظر نہیں

آ سکتی وہ بہر حال بصیرت سے نظر آئے گی ۔ چشمِ بصیرت سے خدا کے قانونِ ربوبیت کی جلوہ فرمائیاں ایک ایک پتے میں مشہود نظر آئیں گی ۔ میں نے کہا ہے کہ دوسرا مقام بھی لیجئے ۔ سوال یہ تھا کہ قرآنِ کریم نے جو کچھ یہ کہا ہے اس کے لیے یہ ثبوت تو واقعی یہ REALITY ہے یہ الحق ہے ۔ میں نے پچھلی دفعہ بتایا تھا کہ حق اور الحق میں فرق کیا ہے؟ THE REALITY ۔ یہ قرآن کے متعلق کہ یہ واقعی الحق ہے کس طرح سے یہ بات ثابت ہوگی؟ یہ لفظی مباحثے اور مناظرے قرآن نے نہیں بتائے ہیں، ایک اندھا ایمان نہیں بتایا ہے، ایک اندھی تقلید نہیں بتائی ہے کہا یہ ہے کہ سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ (41:53)

علم و تحقیق کی بنا پر عالم انفس و افاق میں پڑے ہوئے پردے اٹھتے چلے جائیں گے:

عالمِ انفس و آفاق میں، باہر کی دنیا میں اور انسان کی اپنی ذات کے اندر ہماری آیات چھپی ہوئی ہیں ۔ جو کچھ اس میں ہو رہا ہے جوں جوں اس پہ پڑے ہوئے پردے اٹھتے چلے جائیں گے، انسانی علم و تحقیق، جیسا میں نے کہا ہے وہ لفظ DISCOVER بڑا صحیح ہے ان کے ہاں جو وہ استعمال کرتے ہیں، COVER جو پڑا ہوا ہے اس کو وہ اٹھاتے چلے جاتے ہیں اس کا نام ہے جسے تحقیق کہا جاتا ہے، انکشاف زیادہ اچھا لفظ ہے جو قرآن نے اس کے لیے استعمال کیا ہے ۔ یہ ساری چیزیں یہاں موجود ہیں، قوانینِ فطرت، فطرت کی قوتیں، انسان کے اندر مضمر صلاحیتیں یہ ساری موجود ہیں ان کے اوپر پردے پڑے ہوئے ہیں ۔ تمہاری علم، تمہاری تحقیق، تجسس ان پردوں کو اٹھاتا چلا جائے گا، زمانے کے تقاضے، انسانی علم کا اضافہ، جوں جوں اٹھاتے چلے جائیں سَنُرِيهِمْ اب یہ چیزیں انہیں آنکھوں سے نظر نہیں آتیں پھر یہاں یہ نریھم کا لفظ ہے کہ اس وقت تو یہ چیزیں ہم حقائق کی طرح بیان کر رہے ہیں سمجھنے میں کچھ دقت آ رہی ہے، یہ چیزیں ان پہ پڑے ہوئے پردے اٹھتے چلے جائیں گے تو یہ آنکھوں سے دیکھتے چلے جائیں گے، یہ چیزیں ہم ان کو عالمِ انفس و آفاق میں دکھاتے چلے جائیں گے حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ (41:53) تا آنکہ یہ بات (بین کے معنی ہوتا ہے کسی بات کا ابھر کے سامنے آ جانا) ابھر کے ان کے سامنے آئے گی،

آج کا یہ دور انفس اور آفاق میں چھپی ہوئی کارفرمانیوں کا ظہور، قانونِ خداوندی کے الحق ہونے کا ثبوت ہے:

کیا بات؟ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53) یہ الحق ہے ۔ قرآن کے حقائق اور دعاوی کے الحق ثابت ہونے کے لیے یہ ہے کہ انفس اور آفاق کے اندر چھپی ہوئی خدا کے قانون کی کارفرمائیاں ایک ایک کر کے انسان کے سامنے آ جائیں ۔ اور وہ تو یہ جو سائنس کے محققین ہیں سب سے پہلے تو ان کے سامنے یہ چیزیں آتی ہیں ۔ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53) خیال پیدا ہوا کہ یہ اتنا بڑا دعویٰ اور اس زمانے میں یہ دعویٰ کہ جس زمانے میں اس زمین کے متعلق یہ چیز تھی کہ یہ ایک پڑا ہوا بچھا ہوا بہت بڑا کرہ یا کچھ

بھی ہو یہ پڑا ہے۔ وہ اس زمانے کا پورا آپ کا جغرافیہ یا علم الارض جو تھا وہ یہ ہے اس زمانے کا بطلیموس کا نظام کہ یہ زمین اس طرح سے کھڑی ہے۔ اور کھڑے رہنے کے متعلق سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے کیسے کھڑا جائے۔ تو اس کو کھڑا کرنے کے لیے کہا کہ نیچے پانی ہے پانی میں مچھلی ہے مچھلی پہ بیل ہے بیل کے ایک سینگ کے اوپر یہ زمین ہے۔ تو جب ایک سینگ تھک جاتا ہے تو بیل جب سینگ بدلتا ہے تو زلزلہ اس سے آتا ہے۔

زمین کے ساکن ہونے اور سورج کا اس کے گرد گھومنے کے تصور کے برعکس کوپرنیکس اور نیوٹن کی تحقیق اور قرآن کا اعجاز

عزیزانِ من! یہ اس زمانے کے جہلا کی باتیں نہیں تھیں اس زمانے کے علم الافلاک کے ماہرین کی باتیں تھیں۔ بطلیموسی نظام کہ زمین ساکن ہے سورج اس کے گرد گھومتا ہے یہ کل تک یہی تصور آپ کے ہاں چلا آ رہا تھا یہ نظریہ کل تک ابھی یورپ تک میں چلا آ رہا تھا۔ تا آنکہ کوپرنیکس نے آ کے اور نیوٹن نے آ کے یہ جو نظریہ تھا اس کی تردید کی۔ تو یہ تو ابھی کل کی بات ہے تو چودہ سو سال پیشتر تو اُسی چیز کو حقیقت مانا جاتا تھا۔ تو یہ اتنی بڑی چیز جو قرآن دعویٰ کر گیا ہے کہ زمین بمعہ اپنی تمام مخلوق کے گردش کے اندر بھی ہے اور چلی جا رہی ہے اس قسم کے دعوے کہ كُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (21:33) ہر کرہ اپنے اپنے ORBIT کے اندر مصروفِ گردش ہے۔ یہ قرآن کیسے یہ دعوے کرتا ہے؟ کہا کہ کیسے کا تمہیں تعجب آ رہا ہے اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ (41:53) اس کے متعلق تو یہ بات کہو کہ جس کے سامنے یہ چیزیں نہ ہوں خدا کے تو سامنے یہ ساری چیزیں ہیں پردے تو تمہاری نگاہوں کے سامنے پڑے ہوئے ہیں۔ اَوَلَمْ يَكْفِ (41:53) کہا کہ کیا اس دعوے کے ثبوت کے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ خدا کے سامنے کوئی شے بھی پردے میں چھپی ہوئی نہیں ہے مشہود ہے۔ تو جس کے سامنے ایک چیز ہو اور دوسرا وہ ہے کہ جس کے سامنے پردہ ہو پردے کے پیچھے وہ چیز ہو تو دونوں میں کہا کہ جو فرق ہوتا ہے وہی فرق تم میں اور ہم میں ہے۔ خدا کے سامنے ہر چیز مشہود ہے اسی لیے اس نے عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ (59:22) اپنے لیے کہا۔ غیب اور شہادت تمہاری نگاہوں کے مطابق ہے اس کے نزدیک تو کوئی چیز غیب ہے ہی نہیں۔ تو جو چیزیں تمہارے سامنے مشہود ہو گئیں خیر! ان کی تو بات اور ہے جو ان کا علم جانتا ہے' جو ابھی تمہاری نگاہوں سے غائب ہیں اسے ان کا بھی علم ہے اس لیے کہ اس کی نگاہوں میں وہ مشہود ہیں وہ غائب ہیں ہی نہیں۔ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ (41:53)۔

ذاتِ خداوندی کے دیدار کے سلسلہ میں کائنات کا تو ایک ایک ذرہ القاءِ رب کی ایک زندہ تصویر ہے:

اور اس سے اگلی آیت ہے اَلَآ اِنَّهُمْ فِىْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ (41:54) اس کے باوجود کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ لقاءِ رب کے متعلق ان کو شکوک ابھرتے ہیں۔ دیکھا! کہاں لقاءِ رب آیا ہے۔ کائنات میں چھپی ہوئی آیاتِ خداوندی

سے جوں جوں پردے اُٹھتے چلے جائیں گے لقاءِ رب جو ہے وہ ثابت ہوتی چلی جائے گی۔ عزیزانِ من! بات صاف ہے خدا کا یوں سامنے آ جانا یوں مل جانا یوں ملاقات ہو جانا جسے ہم کہتے ہیں یہ بات تو نہیں ہے یہ تو اس کے قانون کی کارفرمائیاں ہیں جو اس طرح سے آفاق کی چیزوں پر غور و فکر سے مشہود ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ اور یہاں پھر یہ کہا کہ کہنے والے کے متعلق سوچو کون کہہ رہا ہے۔ آلَآ آگاہ رہو' سمجھ لو اس بات کو اَلَآ اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیۡءٍ مُّحِیۡطٌ (41:54) وہ تو ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے۔

لفظ محیط کا مفہوم:

اتنی بڑی چیز جو میں نے کہا تھا کہ وہ تصور کہ کہیں جا کر خدا کو ملا جائے؟ اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیۡءٍ مُّحِیۡطٌ مثال کے طور پر میں یہ کہہ رہا ہوں سمجھانے کو' خدا کی مثال تو یوں نہیں دی جا سکتی' اس نے تو قرآن میں یہ کہا ہے کہ اس کی مثال بھی نہیں جا سکتی لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ (42:12) مثال سے بھی سمجھانا چاہو تو مثال بھی نہیں دی جا سکتی۔ سمجھانے کے لیے محیط جسے ہم کہتے ہیں یہ ASMOSPHERE جو ہے یہ جو ہمیں کچھ نظر نہیں آتا یہ ہم پر محیط ہے' جہاں آپ جائیں گے یہ ATMOSPHERE ہوگا یہ جو ہم سانس لے رہے ہیں محیط اس کو کہتے ہیں' گھیرے ہوئے اس انداز کا جو گھیرا ہوا کوئی چیز ہو کہ کوئی شے اس سے باہر جا ہی نہ سکے۔ وہ کہتا ہے کوئی شے اس سے تو باہر رہی ہوئی نہیں ہے تمہاری نگاہیں ان پردوں کو اٹھا کے دیکھ نہیں رہیں۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا   یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
(غالب)

خوب تشبیہ دیتا تھا یہ شخص بھی۔ یہ پردہ جسے ساز کا کہتے ہیں یہ اصطلاح ہے موسیقی کی۔ وہ تار' ستار کی وہ اس موسیقی اس آواز کا پردہ کہلاتی ہے جو اس تار کے اندر چھپی ہوئی ہوتی ہے اور مضراب کے چھیڑنے سے جاگ اُٹھتی ہے۔ یہ موسیقی کی اصطلاحیں ہیں' اچھی تشبیہ ہے۔ تو کہا کہ یہ خدا جو ہر شے کو محیط ہے اس کے متعلق بس اس سے لقاءِ رب جو ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ یہ جتنی بھی اس کی یہ آیات' قوانین یہاں مضمر ہیں کارگہ کائنات میں کارفرما ہیں ان پر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھاتے چلے جایئے خدا کا لقاء ہوتا چلا جائے گا۔ اس کے معنی ہی ہیں قانونِ خداوندی کی کارفرمائیاں بے حجاب ہو کر تمہارے سامنے آ جائیں گی۔ لیکن جب ہماری گاڑی دوسری پٹڑی پہ پڑ گئی یا ہمیں الجھا یا گیا اور باتوں میں' اب جناب! وہ لقاءِ رب

مرزا غلام احمد کی خدا تعالیٰ سے ملاقات اور خدا سے لکھوانے کا دعویٰ:

اب ہمارے ہاں کے مقربین یہاں جنہیں ہم کہتے ہیں وہ ان کے حصے میں آیا ان کے دعوے اس کے متعلق ہوئے روزرات کو خدا کے سامنے موجود ہیں ان سے کھیل رہے ہیں باتیں ہو رہی ہیں احکام لکھوائے جا رہے ہیں اور پھر کس شکل میں وہ لکھوائے جا رہے ہیں؟ یہ نہ کہنا کہ یونہی روحانی طور پہ ایسا ہو جاتا ہے' مرزا صاحب نے یہ فرما دیا تھا کہ وہ جو فلاں پٹواری ہے (یہ ان کے اپنے ملفوظات میں درج ہے) ان کا کوئی کام اٹکا ہوا تھا جیسے وہ تحصیلدار نے تبادلہ کر دیا تھا لیکن بہر حال وہ پھر خدا کے حضور گئے وہاں سے

اس کی درخواست کے اوپر حکم لکھانا تھا وہاں سے حکم لکھایا' یہ ان کے لکھا ہوا موجود ہے کہ اس کے متعلق تمہیں شبہ گزرے شاید کہ یہ نہیں ہوا' کہ دیکھو! آؤ تمہیں میں دکھاتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ اللہ میاں نے سرخ سیاہی (روشنائی نہیں' سرخ سیاہی!) سے جو دستخط فرمائے تو وہ قلم چلا نہیں تو چھڑکا' اس سرخ سیاہی کے قلم کے چھینٹے جو تھے ان کے کرتے پہ پڑے اور وہ موجود ہے آ کے دیکھ لو۔ انہوں نے کرتہ موجود رکھا ہوا ہے۔ میں کہہ رہا تھا کہ لقاء رب ان کے ہاں کا یوں اس کو کہتے ہیں خدا سے ملاقات۔

تفتیشات، تحقیقات اور تجسس کے سلسلہ میں ہم مسلمانوں کی حالت:

عزیزانِ من! کیا کہا جائے کیسا چکر دیا اس قوم کو پوچھو نہیں۔ انفس اور آفاق کے اندر تحقیقات اور تفتیشات اور تجسس کے سارے کارنامے وہ ملحد اور کافر اور بے دین جو ہیں ان کے لیے چھوڑ دیئے اور اپنے ہاں ملاقاتِ خداوندی روز ہوتی ہے اور وہ اس انداز سے ہوتی ہے۔

رحمِ مادر کی زندگی کی طرح اس زندگی میں کوئی انسان جہانِ فردا کی نوعیت اور وہاں کی نشوونما کے طریق کار کا کوئی ادراک نہیں کرسکتا:

ٹھیک ہے مرنے کے بعد کی دنیا جو ہے وہ اور ہے اس کو تو آج ہم سمجھ نہیں سکتے' وہاں کیا صورت ہوگی کیا شکل ہوگی وہاں تو نہ ہم یہ ہم ہونگے وہاں نہ ہمارا شعور یہ شعور ہوگا۔ وہ جو میں اس مثال کے طور پہ کہا کرتا ہوں رحمِ مادر کے اندر پیدا ہونے سے ایک دن پہلے کا بچہ جو ہے سارے حواسِ خمسہ رکھ رہا ہوتا ہے لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود اس کی کائنات کیا ہوتی ہے؟ ایک اتنا سا نرم سا تھیلا جس کے اندر باہر کی دنیا نہ ہوا جائے نہ آواز جائے نہ روشنی جائے اب وہ بچہ جو وہاں تقاضا کرے کہ مجھے یہ جو وہ گویا اس میں اور یہ باہر کی دنیا کے اندر دیکھئے کہ ذرا ایک جھلی کا ہی فاصلہ ہوتا ہے اس جھلی کے اندر مستور جو بچہ ہے باہر کی کائنات کے متعلق وہ کہے کہ مجھے سمجھاؤ کہ یہ کیا ہے کیسی ہے کتنی بڑی ہے' سوچئے تو سہی۔

انسان کی اس زندگی اور پھر اس کے بعد کی زندگی کے مابین کیفیت کو برزخ کہا ہے:

اسی قسم کی ایک جھلی ہے جس کے اندر ہم یہاں ہیں اس زندگی کے مقابلے میں جو اس کے بعد آنے والی ہے۔ اسی لیے اس کو آپ کے ہاں نئی پیدائش کہا جاتا ہے اس بچے کے پیدا ہونے کے ساتھ ہی پوری کائنات سامنے آجائے گی وہ موجود ہوتی ہے فرق صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ ایک جھلی ہوتی ہے قرآن نے جس جھلی کو برزخ کہہ کے پکارا ہے۔ برزخ کہتے ہی اس قسم کے پردے کو ہیں۔ وہ ایک پیدائش ہے' بچہ موجود ہے' زندہ ہے' پیدا نہیں ہوا اس لیے ہم بھی اس زندگی کے مقابلے میں زندہ ہیں موجود ہیں ابھی پیدا نہیں ہوئے اسی لیے اس کو قرآن نے پیدائش کہا ہے۔ عزیزانِ من! میں کیا عرض کروں بہت کچھ ہے سینے میں' وقت نہیں ملتا۔ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ (13:2) جاؤ غور و فکر کرو' کائنات کے اوپر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھاؤ ایک ایک پردے کے بعد تمہیں خدا کے قانونِ ربوبیت کی جلوہ فروشیاں جو ہیں بے نقاب ہو کر تمہارے سامنے تُوْقِنُوْنَ یقین ہوجائے گا

تمہیں اس طرح سے۔ یہ طریقہ ہے یقین حاصل ہونے کا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ پچھلی آیت کے اندر ابھی چند ایک مظاہر کا ذکر آ رہا تھا درمیان میں لَعَلَّكُمْ کہہ کے کہا کہ یہ بات یونہی ہم ایک سائنٹسٹ کی طرح بیان نہیں کیے جاتے کہ ایک کتاب کے اندر ہم نے درج کر دیا ہے' اس کا ایک مقصد ہے اور مقصد ہے لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ (13:2)۔

کائنات کی اس قدر وسعت پذیری اور کرۂ ارض کے اس گردشی عمل کے باوجود' اس کا پھسلنے سے محفوظ رہنا کس قدر قابلِ غور ہے

اور پھر آگے چلا وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ (13:3) وہ خدا کہ جس نے زمین کو گول ہونے کے باوجود یوں بچھا دیا ہے کہ تمہیں کبھی محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کسی گولے کے اوپر چل رہے ہیں۔ یہ جو یہاں سے دوسرے مقام پہ تَمِيْدَ جو VERB بنایا ہے جو وہاں استعمال کیا ہے اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ کوئی شے انتہائی گردش کے اندر وہ ہو لیکن اس کے اوپر جو چیزیں رکھی ہوئی ہوں نہ وہ کہیں گریں نہ وہ کہیں لڑکھڑائیں نہ وہ پھسلیں نہ ہی ان کو احساس ہو۔ اب آپ کہیں گے کہ اس دور میں تو یہ چیز ابھی وہ عربوں کے ذہن میں نہیں' دنیا میں بھی کہیں نہیں تھی تو اس قوم نے الفاظ کہاں سے بنا لیے۔ خدا نے یہ جو چیز کہی وہ تو عالم الغیب والشہادت تھا اس نے تو یہ چیز کہنی تھی' انہوں نے اپنی زبان میں یہ الفاظ کیسے بنا لیے؟ OBSERVATION بڑی عجیب تھی ان کی' وہ استعمال کرتے تھے وہ کہتے تھے کہ دیکھئے! یہ چکی جو چلتی ہے وہ گھوم رہی ہوتی ہے اس کے اوپر یہ چیونٹیاں وغیرہ چل رہی ہوتی ہیں' دیکھا کہ اس کی اتنی تیز گردش کے باوجود وہ اپنے انداز میں چل رہی ہوتی ہیں۔ تو یہ جو کیفیت ہے کہ کسی چیز کا مصروفِ گردش ہونا اور اس کے اوپر جو چیزیں ہیں ان کا اس سے متاثر نہ ہونا اس کے لیے یہ لفظ انہوں نے بنایا تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کا یہی لفظ ارض کے لیے استعمال کر دیا۔

اہلِ عرب کی زبان دانی کا کوئی زبان مقابلہ نہیں کر سکتی:

اس کی داد کوئی نیوٹن دے سکتا ہے کہ اس زمانے میں قرآن نے ایک بات ایسی سائنٹفک کہنی ہے اور اس کے لیے یہی زبان موزوں ہو سکتی تھی۔ اور قرآن کے نازل ہونے سے پہلے ان عربوں نے اپنے ہاں یہ لفظ زبان میں رکھا ہوا ہے ورنہ لفظ قائم کرنے مشکل ہوتے' قائم کرتا تو وہی عرب کہتے کہ صاحب! ہمیں تو پتہ نہیں کہ یہ کیا لفظ آپ کہہ رہے ہیں۔ کوئی لفظ اس نے قائم نہیں کیا' زبان وہ اختیار کی ہے قرآن نے کہ جس کے اندر ان کے لیے الفاظ موجود تھے۔ وہ جو میں کہا کرتا ہوں کہ ٹھیک ہے حضرتِ ابراہیمؑ کے دونوں بیٹے حضرتِ اسحاقؑ اور حضرتِ اسماعیلؑ تھے۔ حضرتِ اسحاقؑ کی اولاد کے اندر یہ بنی اسرائیل جو تھے یقیناً ان میں مملکت' ملکِ عظیم بھی رہا ان کے ہاں انبیا بھی آتے رہے خانقاہیتیں قائم ہوئیں۔ یہاں وادیٔ غیر ذی زرع کے اندر حضرت اسماعیلؑ آ کے بس گئے۔ یہ ان کی نسل ان کا قبیلہ اتنے ہزار سال کیا کرتے رہے؟ میں کہا کرتا ہوں کہ اتنے ہزاروں سال تک وہ زبان مرتب کرتے رہے کہ جو قرآن کے حقائق کی حامل ہو سکے۔

اس قدر گردش کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ زمین پر پہاڑوں کا ایک لامتناہی سلسلہ اور چٹانوں کے بدلتے ہوئے رنگوں کی مینہ کاری، لقاءِ رب کے سوا اور کیا ہے؟

بہرحال۔ وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ (13:3) مصروفِ گردش ہونے کے باوجود اس کو یوں پھیلا دیا۔ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ (13:3) اور یونہی چیز نہیں ہے کہ ہلکی پھلکی سی ایک چیز ہے اتنے اتنے عظیم پہاڑ اس کے اوپر۔ پہاڑوں کے متعلق تو آپ کو یاد ہے میں نے وہ آیت بتائی تھی کہ جاؤ غور وفکر کرو ان کو یونہی سر ٹکرانے کے لیے بے جان چٹانیں نہ سمجھو، جا کے دیکھو کہ ان کے اندر کوئی سفید دھاری، کوئی سرخ دھاری، کوئی کالی بھجنگ، یہ ایک ہی چٹان کے اندر مختلف قسم کی دھاریاں مختلف قسم کے رنگ۔ اس نے کہا کہ ان کے اوپر غور وفکر کرو، تحقیق کرنے سے تمہیں یہ نظر آئے گا کہ ان کے اندر خدا کا ارتقاء کا ایک سلسلہ جاری ہے۔ قرآن چودہ سو سال پیشتر پتھروں کے اندر زندگی ناچتی ہوئی دکھا رہا ہے۔ وہاں اس نے لقاءِ رب کہا ہے، قانونِ ربوبیت ہے جس کی طرف وہ یہ دلائل یا شواہد پیش کرتا چلا جاتا ہے۔

نظامِ ربوبیت کے سلسلہ میں اس کرۂ ارض پر انگنت پہاڑوں کا وجود، دریاؤں کا وسیع سلسلہ اور سمندر کے پانی کو کشید کرنے کی غرض سے زمین سے 3 لاکھ بڑی انمول فیکٹری کا وجود، یہ سب شعبۂ ربوبیت کی تکمیل ہے:

نقطۂ ماسکہ یہاں ربوبیت ہے۔ اسی اعتبار سے یہاں جو پہاڑ کا ذکر آیا ہے تو پہاڑ کے وہ جو اپنے اندر داخلی تبدیلیاں آ رہی ہیں ان کا یہاں ذکر نہیں کیا، ربوبیت کے لیے کہا وَأَنْهَارًا (13:3) دریاؤں کے لیے ان پہاڑوں کا وجود ضروری ہے۔ اندازہ لگایئے! چودہ سو سال پہلے جب مذہب کی دنیا صرف اِندر دیوتا تک پہنچ سکی تھی کہ ایک دیوتا ہے یہ بادلوں کا ٹھیک ہے بس اس سے بارش ہوتی ہے۔ قرآن نے یہ کہا ہے دوسرے مقام پہ کہ یہ ساری زندگی پانی پہ ہے اور انہیں کہا کہ ہمارا قانونِ ربوبیت تم نے دیکھا ہے کہ پانی کا ذخیرہ تو سمندر میں ہے جس کا ایک گھونٹ پی لیجیے تو زندگی ملنا تو ایک طرف رہا ہلاکت آفریں ہے۔ وہ جو وہ مشہور پرانی نظم پڑھا کرتے تھے

WATER WATER EVERY WHERE , NOT A DROP TO DRING

NOT A DROP TO DRINK

تو یہ جو پانی ہے اس کی تو کیفیت زندگی کے لیے یہ ہے کوئی پودا اگ نہیں سکتا اگے ہوئے پودے پہ ڈال دیجئے اسی وقت جل کے مر جاتا ہے۔ کہا قانونِ ربوبیت کی کافرمائیاں یہ ہیں پانی کا سارا ذخیرہ اس ارض کے اوپر، جان کے لیے ہلاکت اور وہی تمہارے لیے ممدِ حیات۔ کیسے بنتا ہے؟ سورج کی حرارت (قرآن کی تشبیہ میں) اس کی کرنیں وہاں سے ڈول بھر بھر کر پانی کا لاتی ہیں، پانی کس قسم کا لاتی ہیں؟ ساری ہلاکت آفریں چیزیں سمندر میں رہنے دیتی ہیں اور اس میں سے

DISTILLED WATER جو ہے وہ اوپر اٹھا کے لے آتی ہیں۔

سمندری پانی کو فلٹر کرنے کی انسانی کوشش صدیوں سے جاری ہے

انسانی جسم میں فلٹریشن کا فریضہ انسان کے گردے سرانجام دیتے ہیں

عزیزانِ من! جن ملکوں میں پانی نہیں ملتا اور سمندر کے کنارے ہیں ان کے ہاں سب سے بڑی PROBLEM یہ ہے کہ یہ پانی پینے کے قابل اور کھیتی کے قابل کسی طرح بنا دیا جائے۔ اس کے لیے پروسیس تو DISTILATION کا ہی ہے کیونکہ اس کے اندر یہ چیزیں ایسے ملی ہوئی ہیں کہ FILTRATION سے تو یہ چیزیں الگ نہیں ہوسکتیں۔ سمندر کی DISTILATION ' اس کے لیے اتنے دریا بنا دینا یعنی پوچھو نہیں اس کے اوپر جو صَرف آئے گا۔ آپ کو معلوم ہے پچاسوں برس سے قومیں اس کے اوپر بیٹھی ہوئی ہیں اس مسئلے کو لے کے۔ بات میں سے بات نکلتی ہے۔ وہیں انہوں نے ایک چیز پہ غور کیا کہ صاحب! اس طرح سے جو حلول شدہ چیزیں ہیں جن کو الگ کرنے کا' فلٹر کا نہیں ہے' انہوں نے کہا کہ خود خدا نے ایک ایسا فلٹر پلانٹ بنایا ہے کہ اس قسم کی حل شدہ چیزیں بھی اس میں سے الگ ہوجاتی ہیں تو DISTILATION کی ضرورت نہیں فلٹریشن ایسا بناؤ۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ فلٹریشن کا پلانٹ کونسا ہے؟ انسان کا گردہ۔ یہ حل شدہ جوزہریں اندر ہوتی ہیں یا مادے اندر ہوتے ہیں یہ BY PROCESS OF FILTRATION ان کو الگ کرتا ہے۔ آپ کو شاید علم ہو امریکہ کی لیبارٹری کے اندر ساحل کے کنارے' برسوں سے وہ لگے ہوئے ہیں اس گردے کا تجزیہ کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر اس قسم کی کوئی مشین بن جائے جیسے یہ WORK کر رہا ہے مسئلہ حل ہوجاتا ہے۔

نظامِ ربوبیت کے تحت قدرت کی طرف سے فلٹریشن پلانٹ کی نوعیت اور تقسیم کار

اس نے کہا کہ تم دیکھتے ہو کہ یہ ہمارا DISTILATION کا PROCESS' سورج کی گرمی جو ہے تمہیں تو یہی نظر آتا ہے کہ رات کو سونے نہیں دیتی' اس نے کہا کہ یہ گرمی جو ہے سورج کی کرنیں وہاں سے DISTILLED WATER جو ہے وہ اوپر لے جاتی ہیں۔ اس لے جانے کے بعد تو اگر ایسا کہیں پروسیس ہو کہ وہاں لے جائیں اور وہیں برس پڑیں تو آپ سوچیے تو سہی کہ ہمیں کیا اس سے۔ پروسیس وہاں کا یہ ہے کہ یہ وہاں سے پھر آگے چلتی ہیں اور پر جس وقت پہنچتی ہیں تو پھر وہ جو ہوائیں ہیں وہ یہ ویپرز جو بنتے ہیں ان کا وہ رخ جو ہیں بدل کے ان کو وہاں سے چلاتی ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ ہمارے گڈریے ہانک کے انہیں لے جاتے ہیں وہاں جہاں ضرورت ہوتی ہے۔ بدوؤں کو بھی تو بات سمجھانے کی تھی۔ لے آتے ہیں صاحب! بلندیوں کے اوپر پہنچ رہے ہوتے ہیں۔ وہاں آگے پھر پہاڑ کا سلسلہ آتا ہے۔ پہاڑیوں کی چوٹیوں کے اوپر برف جمی ہوئی ہوتی ہے وہ بھی آگے قرآن بتاتا ہے کہ یہ کیوں ہوتی ہے لیکن وہاں کی جو سردی ہوتی ہے وہ آپ دیکھتے ہیں پہاڑوں پہ کتنی زیادہ بارش ہوتی ہے۔ اونچائی پہ جتنے چلے جاتے ہیں ٹمپریچر کم ہوتا چلا جاتا ہے' پہاڑوں کے اوپر برف کی

وجہ سے یہ ٹمپریچر کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ واٹر ویپرز جو ہیں جب کسی خاص ٹمپریچر کے اوپر پہنچتے ہیں تو ابخرہ جو ہے وہ سردی سے منجمد ہو کے وہ پھر پانی بنتا ہے پانی اس سے بھاری ہوتا ہے اس فضا سے جس میں وہ معلق ہوتا ہے بھاری ہونے کی وجہ سے زمین پہ گرتا ہے یہ بارش ہوتی ہے۔ وہ اتنا سا تو ہے وہ زمین پہ گرتا ہے' اب جو یہ ہوتا ہے کہ اتنی زیادہ بارش ہوئی ہے سیلاب آ گئے' وہ تو غنیمت ہے کہ سارے کا سارا نہیں گرتا ورنہ ایک ہی سیزن میں بہہ جائے یہ ساری دنیا۔ وہ اس کے مطابق جتنی ضرورت ہوتی ہے اس کے مطابق ان دریاؤں کے اندر آنے کے لیے بارش کی شکل ہوتی ہے یہ جو باقی بچتا ہے پہاڑوں کے اوپر ریزروائر بنے ہوئے ہیں پہاڑوں کے اوپر جو برف ہے وہ انہی ابخروں سے تو بنتی ہے وہ آسمان سے تو اس کے اوپر ڈھیلے پڑتے ہیں وہ وہاں سردی کے موسم میں محفوظ رکھتا ہے' میاں! گرمی میں تمہارے کام آئے گا یعنی وہاں ریزروائر بنا رکھے ہیں۔ اور جب گرمی کا موسم آتا ہے تو وہ جتنی برف پڑی ہوئی ہوتی ہے وہ پگھلتی ہوئی چلی آتی ہے وہ ساری کی ساری یہ ندی نالوں کی صورت میں آپ کے ہاں یہ بہتی ہوئی چلی آ رہی ہوتی ہے یہ وہ برف ہوتی ہے۔ پھر وہ ساری نہیں پگھلاتا' پگھلا دے تو وہاں ٹھنڈک باقی نہ رہے اگلا پروسیس ختم ہو جائے' وہ جو ہوتا ہے۔ ثمر صرف پھل ہی کو نہیں کہتے بلکہ ہر وہ کھانے کی چیز جو درختوں کے اندر یا فصلوں میں' کھیتوں میں آ جاتی ہے ماحصل اس سارے پروسیس کا ثمر کہلاتا ہے اس سے یہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔

زوجین کا وجود میں آنے کا پروسیس:

یہاں قرآن نے یہ کہا ہے زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ (13:3) انہی کے اندر جوڑا بننے کی صلاحیت رکھ دی جاتی ہے۔ یہ افزائش کا سلسلہ آگے جو چلتا ہے یہ زوآلوجی والے جو ہیں ان سے پوچھئے وہ بتائیں گے کہ یہ ساری نباتات کے اندر اسی طرح سے یہ زوج کا سلسلہ ہوتا ہے نر اور مادے کا سلسلہ ہوتا ہے اختلاط کا سلسلہ ہوتا ہے جس سے یہ بات آگے چلتی ہے۔ کب کہا جا رہا ہے؟ چودہ سو سال پہلے۔ حیوانات میں یہ جو زوج ہیں وہ تو چیزیں سامنے آ جاتی ہیں' نباتات کے اندر بادیٔ النظر میں ہم نے کبھی ایسا دیکھا ہی نہیں' ہمارے سامنے تو ہر پھول ایک جیسا ہوتا ہے۔ ان سے پوچھئے آج کے سائنٹسٹ سے پوچھئے وہ بتائیں گے کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے۔ سلسلے نے آگے بھی تو چلنا ہے۔ پھر انہی چیزوں کی پیدائش کے لیے جن علاقوں میں چھ مہینے تک وہ رات ہی رات رہتی ہے وہاں کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ وہ تو غنیمت ہے کہ وہ ذرا سے اوپر کے علاقے ہیں۔ یہ ہر شے کی اگنے کے بعد اس کی نمو' پرورش' تکمیل تک پہنچنے کے لیے سورج کی روشنی نہایت ضروری ہے۔

اجناس کی پیداوار کے لئے سورج کی روشنی اور رات کی تاریکی اور ٹھنڈک دونوں ضروری ہیں:

آپ اپنے ہاں یونہی جسے آپ کچن گارڈن کہتے ہیں یہ یہاں پیچھے مٹی لگی ہوئی ہے جا کے دیکھئے تو سہی' ایک ہی دن بوئیے' ایک ہی بیج' ایک ہی پانی اس کو دیے جا رہے ہیں ایک جگہ وہ اتنی اتنی سی ہے دوسری جگہ اتنی اتنی اونچی پہنچ گئی ہے۔ فرق کس چیز نے پیدا کیا ہے؟ جہاں دیوار کا سایہ رہتا ہے وہ اتنی اتنی ہوتی ہے جہاں سورج کی دھوپ پڑتی ہے وہ اتنی اتنی بڑھ جاتی ہے۔ روز آپ دیکھتے ہیں ہوتا یہ ہے' درخت کے نیچے اگا ہوا پودا اتنا سا رہتا ہے۔ سورج کی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ صحراؤں کے

اندر سورج جتنی تپش میں رہتا ہے وہاں کچھ نہیں ہوتا۔اس کے لیے ضروری ہے کہ سورج کی روشنی بھی ملے اور اس کے بعد رات کی ٹھنڈک اور تاریکی بھی ملے۔وہ کہتا ہے کہ: يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ (13:3) لفظِ غشیٰ جو ہے پھر یہ آ گے آ گئی چیز۔

ربوبیت کی خاطر نظامِ قدرت کی یہ پیوندکاری ہر لحاظ سے مکمل اور حیران کن ہے:

میں نے گزارش کیا ہے کہ یہ تو نصاب کی کتاب ہے۔یعنی وہ دن کہیں چلا نہیں جاتا وہ رات کہیں بھاگ نہیں جاتی یہ تو ایک گردش ہی کا نام ہے، وہ کہتا ہے موجود ہوتی ہیں، وہ ایک چیز ڈھانپ لیتی ہے، کہیں جاتی تو نہیں ہے۔رات اور دن کی گردش، ربوبیت کے لیے یہ ساری جتنی چیزیں ضروری ہیں یہ چیزیں ہیں جو بیان ہو رہی ہیں۔اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ (13:3) ان چیزوں کے اندر بھی حقیقت تک پہنچنے کے لیے نشانیاں ہیں، علامات ہیں یہ حقیقت تک پہنچنے کے لیے۔کس کے لیے علامات ہیں؟ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (13:3) ان کے لیے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔صاف مصفّٰی پانی بھی آ گیا جس سے کھیتیاں ہیں، مَدَّ الْاَرْضَ زمین بھی بچھا دی، پھر دن اور رات، روشنی اور حرارت اور سکون کے لیے بھی انتظام خود ہی کر دیا۔ایسی ایک عجیب AUTOMATIC لگی ہوئی مشین ہے وہ خود بخود ہی بدلتی چلی جاتی ہے، دھوپ کو بھی، روشنی کو بھی، تاریکی کو بھی، ہم سو رہے ہوتے ہیں خود بخود ہی دن برآمد ہو رہا ہوتا ہے۔یہ اتنا بھی نہیں ہوتا ہے کہ ہمیں اٹھ کے کہیں جا کے پردہ اٹھانا پڑے کہ پھر دھوپ نکلے، ساری دنیا سو جائے، ضرورت ہی نہیں ہے اٹھ کے کچھ کرنے کی وہ AUTOMATIC ہو رہی ہوتی ہے، سورج نکلتا ہے۔یہ سارے انتظامات ہو گئے۔کہا دیکھو تو سہی وہی تمہارے ہاں کی زمین ہے وہی پانی ہے وہی سورج ہے۔وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ (13:4) ساتھ ساتھ ملی ہوئی زمین ہوتی ہے۔وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ (13:4) اور اسی زمین میں سے جو اسی قسم کی ہوتی ہے وہی پانی، وہی سورج، وہی رات، وہی دن، یہاں سے ببول کا درخت اگ رہا ہے، اُسی میں سے انگور نکل رہے ہیں اسی میں سے کھجوریں اگ رہی ہیں آم تھے محروم تھے ورنہ ہم کہتے اسی میں سے ثمرِ بہشت آ رہا ہے لنگڑا بھی اگ رہا ہے۔آم کا ذکر ضرور آنا تھا اگر یہ عربوں کے ملک میں ہوتا۔کہا ذرا دیکھو تو سہی ربوبیت کا کارفرمائیاں۔

کھانے کے اندر لذت اور تنوع انسانوں کے لئے ہے جبکہ حیوان اس نعمت سے محروم ہیں:

عزیزانِ من! یہ جو کھانے کی چیزوں میں تنوع ہے یہ انسان کے لیے بڑی چیز ہے۔حیوانات تک تو یہ بات ہے کہ وہ صرف پیٹ بھرنا جانتی ہیں لب و دہن کی لذت جو ہے اس سے ناآشنا ہیں۔اگر جتنی چیزیں ہمیں کھانے کو ملتیں وہ ایک ہی مزا ان کا ہوتا وہ ایک قسم کی خوراک ہوتی، مرتے بھرتے اس کو کھاتے تو ضرور ایسے ہی کھاتے جیسے جیل خانے میں قیدی کھاتا ہے، جیل خانے کی فضاؤں میں اذیت رساں چیز جو وہاں ہوتی ہے وہ یہ ہوتا ہے کہ روز وہی کچھ ملتا ہے۔وہ ترس جاتے ہیں اتنے سے گڑ کی بھیلی کے لیے، منہ کا مزا بدلنے کے لیے، وہاں سزا برداشت کر لیتے ہیں اتنی سی بھیلی چراتے ہیں۔

زمین کے اندر سے ہر اُگنے والی چیز اپنی جگہ ایک الگ ذائقہ اور الگ شکل لئے ہوتی ہے:

تو سوچئے تو سہی کہ اگر وہی نظام یہاں بھی ہوتا کہ جی ہاں! دیتے تو ہم بہت ہیں' روز وہی کچھ ملے گا' وہی ذائقہ ہوگا۔ تو یہ بدلے گا کیسے؟ کہا بدلے گا! دیکھو تو سہی اس زمین کے اوپر' اسی زمین' اسی پانی' اسی روشنی' اسی حرارت سے تم دیکھو تو سہی کہ ساتھ کے ساتھ قطع کے اندر جو چیزیں اگ رہی ہیں لذت میں مختلف' خوشبو میں مختلف' رنگ میں مختلف۔ عزیزانِ من! وہ ربوبیت جو اس کے ہاں کی ہے اس میں تو ہمارے اس ذوقِ لطیف کی اس نے اتنی رعایت رکھی ہوئی ہے کہ آنکھوں کا سامان بھی اس کے اندر رہتا ہے۔ اور یاد رکھیے! پھل کی پہچان جو ہوتی ہے وہ ہمارا ایک دوست باتیں شاعرانہ انداز میں کیا کرتے تھے' کہنے لگے کہ ٹوکری میں پھل کا ڈھیر لگا ہوا ہو اس میں بعض دانے جو ہیں وہ خوب آنکھ مار دیتے ہیں۔ جتنا خوبصورت شکل پھل کی ہوگی اور وہ ابھرا ہوا ہوگا' جھریاں بھی نہ ہوں' جوانی کا عالم ہو' دیکھنے میں جتنا خوبصورت ہوگا آپ دیکھیں گا اتنا ہی زیادہ وہ لذیذ ہوگا اور اتنی ہی اس کی تاثیر زیادہ ہوگی۔ نگاہوں کے لیے لذت' رنگتیں ان کی مختلف۔ بعض رنگ تو ایسی حسین ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں تو یہ؟؟؟؟ جو ہیں وہ محنت کر کر کے اس رنگ کے مطابق رنگ ملاتے جاتے ہیں۔ یہ عنابی رنگ کیا ہوتا ہے؟ یہ عنابوں سے ہوتا ہے۔ رنگت مختلف' ذائقہ مختلف' لذت مختلف' پھر اس کے بعد کے اثرات مختلف' وہ کہتا ہے اسی زمین سے یہ سارا کچھ ہے۔ کہا کہو! کیا یہ قانونِ ربوبیت جو ہے اس سے ملاقات ہو جاتی ہے یا نہیں ان چیزوں سے آپ کی۔ صِنۡوَانٌ وَّغَيۡرُ صِنۡوَانٍ (13:4) کہتا ہے پھر وہ کھجور دیکھ لیجیے ایک تو یونہی پورے کا پورا درخت اوپر نکل آتا ہے ایک دوسرے قسم کی ہوتی ہیں کہ اس میں سے شاخیں پھوٹتی ہیں اور وہ کہتا ہے کہ اس کے بعد دیکھئے اس کے پھلوں میں کتنا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ تو خیر وہ عرب ہی جان سکتے ہیں۔ اگلا لفظ ہے کہنے لگا يُّسۡقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ (13:4) یہ اس کے اندر سے جو کھاتے وقت ذرا سا گھونٹ منہ میں آتا ہے اس میں یہ فرق ہوتا ہے اس لذت کے اندر پہلا فرق' کہتا ہے ایک ہی قسم کے پانی سے یہ مختلف قسم کے گھونٹ تمہیں آ رہے ہیں۔ وَنُفَضِّلُ بَعۡضَهَا عَلٰى بَعۡضٍ فِى الۡاُكُلِ (13:4) اور پھر کھانے کے اندر آپ دیکھئے کہ ایک کی لذت دوسرے سے کس قدر فائق ہوتی ہے لذیذ تر وہ چیز ہوتی ہے۔ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ (13:4) ان میں بھی بڑی بڑی نشانیاں ہوتی ہیں لیکن کن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں؟ لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ وہ قوم جو عقل وفکر سے کام لیتی ہے۔ وہاں تُوۡقِنُوۡنَ (13:2) کہا تھا پھر يَّتَفَكَّرُوۡنَ (13:3) کہا ہے پھر يَّعۡقِلُوۡنَ (13:4) کہا ہے۔

دینِ خداوندی انسان کو قدم قدم پر عقل وفکر کی دعوت دیتا ہے

جبکہ مذہب عقلِ انسانی کو پامال کر دیتا ہے:

عزیزانِ من! مذہب کے سٹیج پہ کھڑے ہو کے گفتگو ہو رہی ہے جہاں پہلی آواز ہمارے کان میں یہ کہتی ہے کہ مذہب

کے معاملے میں سوچنا جو ہے یہ منع ہے اول من قاس ابلیس سب سے پہلے جس نے فکر سے سوچ سے کام لیا وہ ابلیس تھا۔ یہ کہتے ہیں کہ اس نے منطقی دلیل دی تھی اس نے کہا تھا کہ آدم کو سجدہ کیوں نہیں کیا تو اس میں یہ منطق ہے کہ اسے مٹی سے پیدا کیا مجھے آگ سے پیدا کیا آگ مٹی سے فائق ہوتی ہے اس کو میرے سامنے جھکنا چاہیے مجھے کیوں جھکنا چاہیے منطق ہے۔ اب ان کے ہاں کلیہ بن گیا کہ صاحب! دیکھا اس نے عقل سے کام لیا تھا ساری عمر کے لیے مارا گیا ایک دفعہ عقل سے کام لینے سے۔ اگر تم ساری عمر عقل سے کام لو گے! ۔ وہ قدم قدم پہ یہ کہہ رہا ہے اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ (13:4)۔ اور جن قوموں نے بھی فکر اور عقل اور تفکر سے کام لیا ہے وہ یقین کے درجے پہ پہنچ گئی ہیں۔ عزیزانِ من! اس میں تو آپ کے ہاں کے اصطلاحی کفر اور ایمان کا بھی فرق نہیں ہے۔ جنہیں آپ دنیا بھر کا ملحد اور کافر کہتے ہیں انہوں نے غور و فکر سے کام لیا ہوا ہے۔

دین کائناتی چیزوں کو مسخر کرنے کے بعد اس ماحصل کو ربوبیت عالمینی کے تحت صرف کرنے کا سبق دیتا ہے:

آگے ایک چیز اور آتی ہے جہاں جا کے کفر اور ایمان کا فرق پڑتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ان چیزوں کا جو ماحصل ہے کائنات کی قوتوں سے یہ سارا سامانِ ربوبیت جو ملتا ہے اس کو استعمال کس طریق سے کیا جائے؛ یہ ہے جو وحی دیتی ہے یہ عقل اور فکرِ انسانی نہیں دے سکتی۔ یہاں کفر اور ایمان کا فرق پیدا ہوتا ہے۔ بات آگے بڑی عجیب شروع ہوتی ہے۔ وَاِنۡ تَعۡجَبۡ (13:5)

عزیزانِ من! یہ ساری باتیں آپ نے سنی ہیں اس دور میں جب علم اتنی ترقی کر گیا سائنس کے انکشافات ہمارے ہاں اتنے ظاہر ہو گئے یہ چیزیں جو بیان کی جا رہی ہیں ان میں کچھ زیادہ کوئی تعجب انگیز سی حیرت فروش باتیں نہیں ہیں یعنی عام طور پہ اب یہ علم عام ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود آپ دیکھ رہے ہیں ہم باتیں کر رہے ہیں تو ایک حیرت ہم پہ آ جاتی ہے ایک تعجب کی بات آ جاتی ہے کہ ہاں صاحب! واقعی عجیب چیز ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک تمہارے لیے تعجب کی بات یہ ہے کہ تم مرنے کے بعد دوبارہ زندہ اُٹھائے جاؤ گے:

قرآن کہتا ہے اِنۡ تَعۡجَبۡ یہ کچھ سن کے تمہیں کچھ تعجب ہوا ہے حیرت کچھ ہوئی ہے۔ کہا یہ باتیں وجہٗ حیرت نہیں ہیں وجہٗ حیرت ایک اور بات ہے وہ سنو اور اس پہ تعجب کرو اور وہ وجہٗ حیرت یہ ہے فَعَجَبٌ قَوۡلُهُمۡ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ (13:5) وجہٗ حیرت یہ بات ہے جو یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیا مرنے کے بعد ہم پھر زندہ ہو جائیں گے۔ آہاہاہا! میں کہتا ہوں بات کہنے کا انداز کتنا عجیب ہے۔

عزیزانِ من! ہم سب ان چیزوں کو سن کے آج بھی اس وقت بھی اس محفل میں بھی ہم محوِ حیرت تھے تعجب میں ڈوبے

ہوئے تھے۔ ہمیں مخاطب کر کے وہ کہتا ہے کہ او! تم تعجب میں ڈوبے ہوئے ہو حیرت تم پہ چھا رہی ہے۔ اگر کوئی وجۂ تعجب ہے تو یہ نہیں ہے جو تم نے سنی ہے آؤ ہم تمہیں بتائیں تعجب کرنے کی بات کیا ہے؟ تعجب کرنے کی بات ہے جو یہی کہتے ہیں کہ کیا مرنے کے بعد ہم زندہ ہو جائیں گے ان کی اس بات پہ تعجب کرو۔ کسی بات کے متعلق یہ کہنا کہ یہ اتنی بڑی یقینی چیز ہے اسے بیان یوں کرنا کہ اوان چیزوں پہ تعجب کر رہے ہو یہ تو وجۂ تعجب ہی نہیں ہیں وجۂ تعجب ان کی یہ بات ہے جو یہ کہہ رہے ہیں' پاگل کہیں کے نہ ہوں تو۔

Stone کی طرح سخت کھجور کی گٹھلی کا پرورشش پا کر پھل دینا کیا یہ حقیقت نہیں؟

عزیزانِ من! سوچیے! ایک گٹھلی وہ بھی آپ کھجور کی دیکھیں گے تو پیپئے گا تو وہ بے جان ستو سا ہوتا ہے۔ انگریزی زبان میں ان گٹھلیوں کو STONE کہتے ہیں۔ سوچیے تو سہی! زمین کی مٹی میں وہ ملا دی جاتی ہے اور اس کے اندر سے ایک زندہ چیز پیدا ہوتی ہے وہ خود اپنی پرورش کا سامان لیے ہوئی بڑھتی چلی جاتی ہے ابھرتی چلی جاتی ہے۔ اور اس کے بعد اس کے اندر اس قسم کے پھل لگتے ہیں یہ سارا کچھ اس STONE سے یہ پیدا ہوا جو اسی قسم کی مٹی میں مل گئی۔ اب دیکھئے! بات کہاں سے کہاں آ گئی۔ یہ ہے وہ چیز جس کے لیے قرآن یہ SCIENTIFIC چیزیں بیان کر رہا ہے' سائنس کی کتاب نہیں یہ کہنے کے لیے وہ بات کر رہا ہے کہ یہ چیزیں چونکہ روزمرہ ان کی آنکھوں کے سامنے واقع ہوتی ہے اس پہ تو کبھی ان کو تعجب نہیں ہوا کہ صاحب! یہ کس طرح سے ایک ایک STONE سے' گٹھلی سے جو ان کی نگاہوں میں بے جان ہے (ان کی نگاہوں میں میں نے کہا ہے) اس سے اسی قسم کی بے جان مٹی میں ملنے سے یہ سارا کچھ تمہارے سامنے آ جاتا ہے۔

موجودہ تحقیق کے مطابق کھیتوں کے کنارے میوزک دوگنی پیداوار فصل کا باعث بنتا ہے جبکہ ڈیری فارم میں میوزک کی آواز سے گائے زیادہ دودھ دیتی ہے:

اور اب تو تحقیق یہ بھی ہو گئی اور اب یہ ساری چیز دنیا میں پھیل گئی ہے کہ ان نباتات' پودوں کے اندر احساس ہوتا ہے' دکھ درد تکلیف اور اذیت کا احساس ہوتا ہے۔ ان پودوں کی کیفیت یہ ہے اب اس پہ تجربہ ہو رہا ہے خاص قسم کا میوزک کھیتوں کے کنارے پہ بجا دیتے ہیں اس سے فصل دوگنی ہو جاتی ہے۔

عزیزانِ من! میں ان کا میوزک کہتا ہوں یہاں کا نہیں کہتا ہوں کہ جس سے کم بخت زندہ بھی مر جاتا ہے۔ بہرحال شرافت اور نجابت' اخلاقیات' حیا' شرم یہ تو اس میوزک کے صدقے میں مرتے ہوئے روز ہم دیکھ رہے ہیں۔ ایک ان کے ہاں کا میوزک ہے ڈیری فارم میں جا کے رکھ دیتے ہیں لے جا کے آپ کو بتا دیتے ہیں کہ اسی گائے نے کل یہ ایک بالٹی دودھ کی دی تھی اور وہاں جو وہ بھیروی کی ٹیون وہاں شروع کر دیتے ہیں دوگنا دودھ دے دیتی ہے' دوگنی فصلیں لے رہے ہیں۔ یعنی ان کے اندر احساسات یہاں تک ہیں۔ وہ ایک گٹھلی جسے STONE کہہ کے پکارا گیا تھا زمینِ مردہ کے اندر وہ داخل

ہوتی ہے اور اس میں سے یہ چیزیں جو ہیں یہ پیدا ہوتی ہیں۔

انسان کا مٹی میں دفن ہونے کے بعد کھجور کی گٹھلی کی طرح
ایک جہانِ نو سے متعارف کرانے کا پروگرام:

کہا یہ سب چیزیں یہ دیکھنے والے! کہا کہو! ان کا یہ کہنا جو ہے یہ زیادہ وجۂ تعجب ہے یا یہ زیادہ وجۂ تعجب ہے کہ گٹھلی سے پودا کیسے ہو گیا۔ وَاِنۡ تَعۡجَبۡ (13:5) ان باتوں پہ تعجب کرنے والو! یہ وجۂ تعجب نہیں ہیں، آؤ ہم بتائیں وجۂ تعجب کیا بات ہے؟ تعجب کرنا ہے تو ان کی اس بات پہ تعجب کرو کہ کیا ہم جب مٹی میں ملا دئے جائیں گے تو وہاں سے پھر نمود ہو گی۔ کہا! ان سے پوچھو کہ روز جا کے اپنی ان گٹھلیوں کو مٹی میں ملا کے آتے ہو لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ (13:5) وہ خلقِ جدید کے اندر نمود اس کی ہوتی ہے یا نہیں، وہ جو کونپل پھوٹتی ہے وہ گٹھلی جیسی ہوتی ہے؟ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ۔ اس گٹھلی کو باہر میز کے اوپر پڑا رہنے دو، ساری عمر پڑا رہنے دو پھر دیکھو تو سہی اس میں تو خلق جدید نہیں ہوتی۔ پھر وہ جو ہمارا قانون ہے کہ اس میں اتنا پانی دو، اس کو اتنی ہوا ملے، اتنی روشنی ملے، اس کے تابع تم دیکھتے ہو کہ وہ خلقِ جدید جو ہے وہ نمودار ہوتی ہے۔

خدا تعالیٰ کا نظامِ ربوبیت تو کروڑہا سال سے آگے ہی آگے چلتا جا رہا ہے
اور اہل بصیرت کے لئے تو ابھی سینکڑوں منازل اور باقی ہیں

انسان کی یہ جو موت جسے تم یہ کہہ رہے ہو زیادہ سے زیادہ یہی کہو گے کہ یہ ایک کھجور تھی یہ اس کی گٹھلی بن گئی جس میں زندگی کی نمود کہیں نہیں مل رہی، لاش کو یہی کہو گے ایسا ہی ہے موت یہی کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے کرتی ہے۔ تو یہ جتنی مردہ چیزیں ہیں تمہاری آنکھوں کے سامنے وہ زندہ ہو رہی ہوتی ہیں یا نہیں؟ اپنے متعلق جب بات آتی ہے تو وہاں کیوں تمہیں موت پڑ جاتی ہے۔ لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ (13:5) یہ کیسے ہو رہا ہے؟ قانونِ ربوبیت ہے کہ تم کیا سمجھتے ہو کہ ہمارا قانونِ ربوبیت کروڑ ہا کروڑ سالوں سے جو چلتا ہوا ایک جرثومے سے بات شروع کی اور پیکرِ آدمیت تک وہ ربوبیت آ گئی، اب فرق صرف اتنا ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ ہمارے پروگرام کی تکمیل ہو گئی اور ہم یہ کہتے ہیں کہ نہیں! تکمیل کی طرف لے جانے والی ایک کڑی ہے تکمیل ابھی اور آگے ہونی ہے۔ وہی قانونِ ربوبیت ہے جس نے آگے بھی اس گٹھلی کو ایک درخت کے اندر تبدیل کرنا ہے۔ کہا اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّہِمۡ (13:5) یہ پتہ ہے! کس چیز سے انکار کرتے ہیں؟ اس کے قانونِ ربوبیت سے انکار کرتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ ربوبیت کی تکمیل ہو گئی، یہ سلسلہ ختم ہو گیا آگے نہیں بات چلتی، قانونِ ربوبیت سے انکار کرتے ہیں۔ کیوں یہ انکار کر رہے ہیں، اقرار کس طرح سے ہونا تھا، یقین کیسے آنا تھا؟ تو قانون جو کہا ہے غور و فکر سے، تعقل سے، بصیرت سے، تجربات سے، مشاہدات سے، مطالعہ سے یوں یہ چیز آنی تھی۔ کہا ان کی کیا کیفیت ہے؟ وَاُولٰٓئِکَ الۡاَغۡلٰلُ فِیۡۤ اَعۡنَاقِہِمۡ (13:5) گردنیں زنجیروں میں بندھی ہوئی، جھکی ہوئی، دیکھنے کے قابل ہی نہیں۔

لفظ تقلید کا مفہوم عقل وفکر سے محروم:

آپ کو پتہ ہے یہ لفظِ تقلید جو ہے کس کو کہتے تھے؟ قلدَ یہ جو بھینس گائے کے گلے کے اندر وہ ایک طوق سا ڈالا ہوا ہوتا ہے وہ ڈالے ہی رکھتے ہیں اس سے رسی ساتھ باندھتے ہیں۔ تو وہ جو اس طرح سے وہ باندھا ہوا ہوتا ہے کہ جس کے بعد پھر وہ اس کو جدھر جی چاہے کھینچ کے لیے چلے جایئے اس کی ساری آزادیاں سلب ہو جاتی ہیں یہاں سے ہے یہ تقلید۔ تو کہا کہ تقلید کی اغلال گویا کچی رسی بھی نہیں جو ٹوٹ جائے تقلید کی مضبوط زنجیر گلے میں پڑی ہوئی ہے۔ سمجھنے سوچنے فکر کرنے کی صلاحیتیں ہی سلب ہو جاتی ہیں جب یہ چیز ہو۔ جب یہ بات ہو کہ صاحب! یہ چیز ہمارے ہاں اسلاف کرتے چلے آ رہے ہیں، ہم بھی یہ کہہ رہے ہیں یہ ہے چیز۔ قرآن نے کہا ہے کہ گردنیں زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں سر کو اوپر ہی اٹھنے نہیں دیتیں ادھر اُدھر دیکھنے کی آزادی ان کو نہیں مل سکتی۔ وہی سامنے کا وہ راستہ، پچھلی بھیڑ سے پوچھئے کہ تم ادھر کیوں جا رہی ہو؟ وہ یہ کہے گی کہ اگلی جو جا رہی ہے۔ تقلید کے اندر سوچ کا مادہ ہی نہیں ہوتا۔ کہتا ہے یہ اس لیے ہے۔ جس راستے کے اوپر چلے آ رہے ہیں اس راستے کے اوپر چلے جا رہے ہیں۔ جن کے ہاں کے جغرافیہ میں آج بھی تین ہی بِر اعظم ہوں کیونکہ وہ کتاب اس زمانے میں لکھی گئی تھی جب یہ دو ابھی یہ آسٹریلیا اور امریکہ دریافت نہیں ہوئے تھے ان کا اضافہ ہی نہیں ہوتا۔

دلچسپ سی بات یاد آ گئی۔ لارڈ کرزن تھا وہ علیگڑھ یونیورسٹی میں گیا تھا وہاں جغرافیہ کے ایک پروفیسر تھے ان کی اس زمانے میں بڑی شہرت تھی۔ تو اس نے جا کے یہ پوچھا کہ جی! جب آسٹریلیا دریافت نہیں ہوا تھا تو دنیا میں سب سے بڑا جزیرہ کونسا تھا؟ تو انہوں نے نام لے دیا ہوگا کسی ایک جزیرے کا جو اس زمانے میں سب سے بڑا تھا۔ کرزن نے کہا کہ نہیں جناب! میں تم سے زیادہ علم کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن اتنی سی بات کہتا ہوں کہ اس وقت بھی سب سے بڑا جزیرہ بھی آسٹریلیا ہی تھا دریافت نہیں ہوا تھا۔ لیکن یہ جو گلے کے طوق ہوتے ہیں اغلال، ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ تین ہی بِر اعظم مانتے تھے اب تک یہ مانتے ہیں کہ یہ زمین اسی طرح سے ساکن پڑی ہوئی ہے۔ کہا کہ کوئی بات نہیں ہے یہ جو کچھ کرتے ہیں ان کے اس طرح سے سر جھکائے ہوئے، حیوانوں کی طرح نیہوڑائے ہوئے، گردن جھکائے ہوئے، ایک راستے کے اوپر بندھے ہوئے چلے جانے سے کائنات کا کچھ نہیں بگڑتا ہمارے قانونِ ربوبیت کا کچھ نہیں بگڑتا۔ ہوتا کیا ہے؟ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ (13:5) ان کی جتنی بھی امیدوں کی، ترقیوں کی، علم کی دنیائیں ہیں وہ ساری جھلس کر رہ جاتی ہیں آگے چل ہی نہیں سکتا۔ اور یہ کوئی وقتی بات نہیں ہے هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ (13:5) جب تک گردن کو اسی طرح سے جھکائے ہوئے حیوانوں کی طرح چلتے چلے جائیں گے اسی کیفیت کے اندر یہ رہیں گے یہ کیفیت بدل نہیں سکتی۔

یہاں تو پھر سر اٹھا کر چلنا ہوگا چاروں طرف دیکھ کر چلنا ہوگا یہ اس لیے کائنات ہم نے بنائی تھی یہ چیز کرو گے پھر یہ صورت پیدا ہوگی ورنہ تمہاری امیدوں کی، فارغ البالیوں کی، آزادیوں کی، ترقیوں کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں گی۔ کہتا ہے اس کے اوپر یہ بات کہیں گے کہ صاحب! وہ تو نہیں جھلس گئیں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے یہ ٹھیک ہے۔ آپ قرآن میں

دیکھیں گے وہ بار بار یہ کہتے ہیں کہ یہ جو تم کہتے ہو کہ ہمارے غلط نظام سے۔

فلسطین کی وہ وادی جس کا نام جہنی تھا یہاں ایک بت کے سامنے انسانوں کو جلا کر قربانی دیتے تھے:

یہ تو کائنات کی بات آ رہی تھی آگے نظام کی بات آتی ہے کہ یہ سب کچھ بھی ہو نظام غلط ہو تو پھر بھی انسانیت کی کھیتی جو ہے وہ جھلس جاتی ہے اس وقت یہ سامان نہیں جلتا اس وقت پھر انسان جلتا ہے۔ تو آپ کو پتہ ہے یہ جہنم جو قرآن نے لفظ استعمال کیا ہے یہ کس کے جلنے کے لیے کہا ہے؟ سامان نہیں جلتا ہے۔ یہ SANATIC زبان میں یہ ایک مشہور چیز تھی وہاں فلسطین کے اندر ایک وادی تھی جہنی اس وادی کا نام تھا اس وادی کے اندر ایک بہت بڑا بت تھا تو اس بت کے سامنے زندہ انسانوں کو جلا کر قربانی دیتے تھے۔ جہاں انسانیت کو جلایا جاتا ہو کسی کی انسانیت جلتی ہو وہاں سے یہ لفظ لے آیا ہے قرآن' جہنم کے معنی وہ وادی وہ مقام جہاں انسانیت جل جاتی ہے۔ انسانیت کب جلتی ہے؟ جحیم کا لفظ پھر وہ لایا ہے جحم کے معنی ہی ہیں کسی چلتی ہوئی چیز کا رک جانا۔

جہاں سلسلۂ ارتقاء رکتا ہے وہاں ٹھیک ہے محسوس' مشہود' طبعی سامان جو ہے ہزار درجے کے اوپر محفوظ رہے اس کو محفوظ بھی رکھا جا سکتا ہے' انسانیت جل جاتی ہے جب ارتقاء رک جاتی ہے۔ ارتقاء کے رکنے کا نام جحیم ہے اس لفظ کا ترجمہ یہی ہے روک کو کہتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ ہے جسے قرآن جہنم کہہ کے پکارتا ہے۔ تو یہ سارے ساز و سامان تو رہتے ہیں بہت بڑھتے چلے جاتے ہیں یہ چیز ہوتی ہے۔

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے   وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج   یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

جہنم میں تو جل جاتا ہے۔ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ (13:6) کہا اس نظام کی خرابیاں تم بتاتے ہو اور ان سے کہتے ہو کہ تباہ ہو جاؤ گے برباد ہو جاؤ گے۔ ہر جگہ قرآن نے ان سے کہا ہے کہ جب یہ تم کہتے ہو تو کہتے ہیں کہ کیوں نہیں وہ تباہی آتی کیوں نہیں وہ بربادی آتی۔

کسی عمل کا نتیجہ نکلنے کا وقفہ بھی ایک رحمت ہے تاکہ انسان اپنی غلطی کا ازالہ کر سکے:

قرآن کہتا ہے کہ یہ بھی ہماری ایک رحمت ہے کہ ہم نے عمل اور اس کے نتیجے میں ایک وقفہ دے رکھا ہے ایک مہلت دے رکھی ہے۔ وہی مثال ہے بیج کے فصل بننے تک کے لیے ایک وقفہ ہوتا ہے۔ یہ کہتے یہ ہیں کہ نہیں صاحب! وہ وقفہ نہیں ہونا چاہیے اُدھر سے بیج ڈالا اُدھر سے اُگا کے بتا دو جب ہم مانتے ہیں۔ کہا یہ کس چیز کے لیے جلدی مچا رہے ہیں؟ اگر تو یہ چیز ہو کہ صاحب! نہیں جی! تیس کا چاند کچھ نہیں وہ عید کیا ہوئی' جلدی انتیس کو نکل آنا چاہیے ٹھیک ہے عید کے لیے تم کہتے ہو

کہ ایک خوشی کی چیز آنے والی ہے۔ کہتا ہے کم بختوں سے کہا یہ جاتا ہے کہ تمہاری تباہی آ رہی ہے تو تمہیں کچھ خوش ہونا چاہیے کہ چلو کچھ وقت تو مل گیا ہوا ہے ٹل رہی ہے وہ کہتا ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ یہ وقفہ جتنا ہے اس کو ختم کر کے وہ اب کیوں نہیں آتی۔ کہتا ہے ان کی عقلوں کو دیکھئے کسی اچھی چیز کے لیے اگر جلدی کوئی کرے تو بات بھی ہے یعنی اگر یہ کہا جائے کہ صاحب! وہ پوسٹ مین جو ہے اس کو جلدی آنا چاہیے میرے لیے منی آرڈر لائے تو بات بھی ہوئی۔ وہ پراپرٹی ٹیکس والا جو آنے والا ہوتا ہے اس کے لیے تم کہہ رہے ہو کہ بڑی جلدی اس کو آنا چاہیے۔ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ (13:6) پھر غور و فکر کی طرف آ گیا' تاریخ اب سامنے آ گئی۔ حالانکہ ان سے پہلے ان کے سامنے ایسی گزر چکی ہیں جو ان کے لیے مثال بن سکتی ہیں کہ جو کچھ یہ معاشرے میں کر رہے ہیں اس کا نتیجہ وہ نکلا کرتا ہے۔ نتیجہ تو ان کے سامنے ہے زور لگا رہے ہیں آپ کو تاکید کر رہے ہیں بار بار یہ کہہ رہے ہیں کہ وقفہ پھر کیوں ابھی کیوں نہیں موت آ جاتی۔ کہا وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ (13:6) آہاہاہا! پھر رب آیا ہے۔

یہ بھی اس کا قانونِ ربوبیت ہے یہ بھی اس کی قانونِ رحمت ہے کہ عمل کے نتیجے میں فوراً تباہی نہیں آ جاتی لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ وہ حفاظت کا سامان دیتا ہے مہلت کا وقفہ حفاظت کا سامان ہے۔ حادثے سے فوری موت واقع ہوتی ہے کسی مرض سے فوری موت واقع نہیں ہوتی اس میں وقفہ ضرور ہوتا ہے' یہ وقفہ کیا ہے؟ حفاظت کا سامان ہے کہ اب بھی جان بچ سکتی ہے اب بھی جان بچ سکتی ہے۔ یہ کیوں دیا ہے یہ حفاظت کا سامان؟ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَ (13:6) اس کی ربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سامانِ حفاظت پہنچاتا چلا جائے۔ عزیزانِ من! لفظ ہے عَلٰى ظُلْمِهِمْ تمہاری ان ساری زیادتیوں کے باوجود وہ پھر بھی تمہیں موقع دیتا چلا جاتا ہے عَلٰى ظُلْمِهِمْ اور جب یہ وقت ختم ہو جاتا ہے تو ان سے کہو کہ ڈرانا نہیں ہے' دھمکی نہیں جو ہم دے رہے ہیں اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ (13:6) یہاں عقب ہے' پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے آ کر دبوچ گا۔ اس کا جو قانونِ ربوبیت ہے مغفرت کا جو حصہ ہے اسے تو تم کو غنیمت سمجھنا چاہیے وگرنہ اس کے پکڑنے میں دیر کیا لگے گی مشکل کیا ہے اس کے لیے۔ وہ تو جب ہو کہ تم اکیلے کہیں اشتہاری مجرم بن رہے ہو کہیں پکڑے ہی نہ جا رہے ہو انڈر گراؤنڈ چلے گئے ہو' سوال ہی نہیں۔

جس چور کے پیچھے سپاہی لگا ہوا ہے اس کے پکڑنے میں مشکل کیا ہوتی ہے۔ تو کہا کہ اس لیے ہم دبوچ نہیں لیتے کہ شاید اب بھی تم باز آ جاؤ' اب بھی اصلاح کر لو' اب بھی یہ چیز کر لو۔ اور وہ تو اتنا رحیم واقع ہوا انسانوں کے ساتھ کہ جب انسان اپنے ہاتھوں کے ظلم کی لائی ہوئی تباہی سے مرنے لگتے ہیں وہاں خدا یہ کہتا ہے يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ (36:30) او میرے بندو! تم نے کیا کیا اپنے ساتھ۔ اتنا ذو مغفرت اور اتنا ذو رحمت خدا ہے لیکن قانون جو ہے پھر وہاں آ کے جذبات کچھ نہیں کام دیتے اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ (13:6) ہم سورۃ الرعد کی آیت 6 تک آئے ہیں ساتویں آیت سے ہم اگلے درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

خواجہ ازہر عباس (فاضل درسِ نظامی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

توبہ کا قرآنی مفہوم
(ایصالِ ثواب اور ایصالِ عذاب)

توبہ سے متعلق اصل مضمون شروع کرنے سے پیشتر ایک ضروری بات تحریر کرنی مناسب معلوم ہوتی ہے۔ جو اہم بھی ہے اور اس مضمون کا ملخص بھی۔ توبہ کوئی دعا پڑھ لینا یا کچھ الفاظ دہرانے کا نام نہیں ہے۔ توبہ ایک عملی اقدام ہے جس سے غلط کام کا نتیجہ ختم کیا جاتا ہے۔ اس کی وضاحت آگے آتی ہے۔

ہمارے ہاں بہت سے الفاظ اور بہت سے نظریات ایسے مروج ہیں جن کا کوئی مفہوم نہیں ہے اور جو بالکل بے معنی ہیں۔ لاہور میں حضرت داتا صاحب کے مزار پر پندرہ پندرہ، بیس بیس لوگوں پر مشتمل ٹولیاں دستیاب ہوتی ہیں۔

آپ ان سے کہیں کہ مجھے مثلاً اپنے والد کو ایصالِ ثواب کرانا ہے۔ تو اس گروپ کا سربراہ آپ سے کچھ رقم لے گا اور چند پارے یا کچھ دعائیں تلاوت کر کے آپ کے والد کو ایصالِ ثواب کر دے گا۔ اس کے برخلاف ہمیں R.SS کے بانی ساورکر سے نفرت ہے کیونکہ وہ مسلمانوں کا دشمن تھا ہم چاہتے ہیں کہ اُسے ایصالِ عذاب کرائیں۔ لیکن یہ ٹولی ایصالِ عذاب نہیں کراتی۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ایصالِ ثواب تو ہوسکتا ہے لیکن ایصالِ عذاب نہیں ہوسکتا۔

ایک شخص غصہ میں یا مذاق میں اپنی بیوی کو زبان سے طلاق کا لفظ کہہ دیتا ہے تو علماء اس کو طلاق دینا گردانتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر طلاق کا لفظ تین مرتبہ دہرادیں تو اس کو طلاق بائنہ شمار کیا جاتا ہے۔ یہ طلاق صرف زبان سے الفاظ ادا کر دینے سے ہو جاتی ہے، اس میں کوئی بھی Process نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی قانون کو سومرتبہ یہ کہہ دے کہ میرا تیرا نکاح ہو گیا ہے تو وہ نکاح شمار نہیں ہوتا۔ اس کے لئے باقاعدہ عملی اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے۔

بہت عرصہ ہوا ایک فلم آئی تھی۔ جس میں حقیقی زندگی کے ایک جوڑے نے کام کیا تھا۔ شوہر اور زوجہ دونوں مشہور ہیں ہم ان کا نام تحریر کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ اس فلم میں بھی وہ شوہر اور زوجہ بنے تھے فلمی کہانی کے مطابق شوہر نے بیوی کو طلاق دے دی۔ ہمارے علماء نے کہا کہ اس فلمی طلاق سے اُنہیں اصلی زندگی میں بھی طلاق ہوگئی اس لئے انہیں تجدید نکاح کرانی چاہئے۔

اللہ کی طرف رجوع کرو۔ اللہ سے جڑے رہو۔ اللہ سے چمٹے رہو۔

اس طرح کے الفاظ ہمارا مذہبی طبقہ دہراتا رہتا ہے جو الفاظ بالکل بے معنی اور بے مطلب ہوتے ہیں۔ لوگ عموماً اس کا مطلب یہ لے لیتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ پرستش کرو۔ نوافل کثرت سے پڑھو، تہجد پڑھو، ہمارے علماء اللہ سے جُڑے رہنے کا طریقہ پرستش کو قرار دیتے ہیں اللہ کی اطاعت کرنا ان کے پیشِ نظر نہیں ہوتا۔

بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ مسلمان اطاعت اور پرستش میں فرق نہیں کرتے۔ اس وقت ساری دنیا میں اللہ کی پرستش ہو رہی ہے۔ ایک گز زمین پر بھی بطور نظامِ قرآنی اللہ کی اطاعت نہیں ہو رہی۔ ہمارے ہاں پاکستان میں بھی اللہ کی پرستش ہوتی ہے۔

مولانا وحید الدین خاں صاحب، ہندوستان کے صفِ اوّل کے علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ ہمارے دل میں ان کی بزرگی کی وجہ سے ان کا احترام ہے۔ وہ اقامتِ دین کے قائل نہیں ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی ایک بڑی جامع اور بنیادی کتاب ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں'' ہے۔

یہ کتاب دین کی داعی ہے۔ مولانا وحید الدین خاں صاحب نے مودودی صاحب مرحوم کی اس کتاب پر تبصرہ وانتقاد تحریر فرمایا ہے جس کا نام ''تعبیر کی غلطی'' ہے۔ انہوں نے اس کتاب کے انتقاد کے سلسلہ میں جو تحریر کیا ہے اس میں سے دس مختصر ترین فقرے ہم جناب کے مطالعہ کے لئے پیش خدمت عالی کرتے ہیں۔

(1) تعلق باللہ سے مراد اللہ سے گہری وابستگی ہے۔ (صفحہ نمبر: 153)

(2) زندگی کا اصل مقصد خدا سے تعلق پیدا کرنا ہے۔ اس سے لپٹ جانا ہے (صفحہ نمبر: 214)

(3) اسلام دراصل خدا سے تعلق جوڑتا ہے۔ (صفحہ نمبر: 277)

(4) دین کی اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان تعلق کا عنوان ہے (صفحہ نمبر: 140)

(5) حج خدا کی پرستش کے محور پر اہلِ ایمان کی ایک عالم گیر برادری بنانا ہے۔ (صفحہ نمبر: 138)

(6) اپنے رب سے قلبی اور روحانی تعلق پیدا کرنا (اصل دین ہے)۔ (صفحہ نمبر: 148)

(7) (مودودی صاحب کے لٹریچر میں) اسلام کا روحانی پہلو دب گیا ہے۔ (صفحہ نمبر: 144)

(8) نماز قائم کریں۔ جس کی روح عجز اور اشتیاق کے ساتھ اپنے رب سے جڑ جانا ہے۔ (صفحہ نمبر: 271)

(9) مگر ان کے اندرون کو نہیں جگاتا۔ (صفحہ نمبر: 273)

(10) دین کی ایک آخری حقیقت ایک باطنی ادراک ہے۔ (صفحہ نمبر: 301)

حضرت مولانا کی یہ کتاب 344 صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں اسی قسم کے نظریات تحریر ہیں۔ کسی ایک بھی نظریہ کی تائید میں کوئی آیت درج نہیں ہے۔ یہ تمام نظریات قرآن کے خلاف، بالکل بے معنی ہیں۔ کوئی Concrete مفہوم ایک کا بھی سامنے نہیں آتا۔ ایک فقرہ بھی نہ قابل عمل ہے نہ کسی ایک فقرہ کا اس عملی دنیا سے کوئی تعلق۔ قرآن کریم ہر زمانہ کی انسانیت

کے مسائل کو حل کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہی اس کا وحی ہونے کا ثبوت ہے۔ لیکن ان نظریات کا قرآن کے اس دعویٰ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ نظریات صرف مولانا کے نہیں ہیں وہ ہندوستان کے مقبول ترین عالم ہیں اور ایک بڑی تعداد ان کو دنیا بھر میں Follow کرتی اور ان کو سراہتی ہے۔

یہ نظریات صرف مولانا کے نہیں ہیں، ہماری ساری پیشوائیت ساری طریقت، خود مذہب اور سب مذہب زدہ لوگوں کے یہی نظریات ہیں۔ یہی وہ نظریات ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو تباہ و برباد کیا ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کو اس حالت تک پہنچایا ہے۔ معاف بفرمائید، مولانا کے سارے نظریات قرآن کے خلاف، بے معنی، نا قابلِ عمل ہیں۔ جب تک مسلمان ان نظریات کو ترک نہیں کریں گے، وہ ایں سورا ندہ وآں سو درماندہ ہی رہیں گے۔

توبہ کے معنی اور اس کا مفہوم امام راغب نے مفردات میں تحریر کیا ہے ''اعتذار کی تین ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ عذر کنندہ اپنے جرم کا سرے سے انکار کردے اور کہہ دے لَمْ اَفْعَلَهٗ، میں نے یہ کیا ہی نہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے لئے وجہِ جواز تلاش کرے اور بہانے تلاش کرنے لگے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اعتراف جرم کے ساتھ آئندہ نہ کرنے کا یقین دلائے۔ الغرض اعتذاز کی یہ تین ہی صورتیں ہیں اور کوئی چوتھی صورت نہیں ہے اور آخری صورت کو توبہ کہا جاتا ہے۔

اب آپ توبہ کا قرآنی مفہوم ملاحظہ فرمائیں:

آپ کو لاہور سے اسلام آباد جانا تھا۔ آپ غلطی سے ملتان جانے والی ٹرین میں سوار ہوگئے جو بالکل دوسری سمت کی طرف جارہی تھی کچھ دیر بعد آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، تو آپ پتوکی کے اسٹیشن پر اس ریل سے اتر گئے اور پتوکی سے آپ نے لاہور جانے والی گاڑی لی۔ آپ اگر پتوکی کے اسٹیشن ہی پر کھڑے ہوئے سومرتبہ بھی زبان سے توبہ کہتے رہیں، آپ لاہور نہیں جاسکیں گے۔ توبہ ایک عملی اقدام ہے جس کے کرنے سے غلطی کا ازالہ ہوجاتا ہے۔ اور مُضرِ اثرات محو ہوجاتے ہیں۔ اس میں پہلا قدم غلطی کا احساس، دوسرا اور اہم قدم غلط روش کو ترک کرنا، اور تیسرا قدم صحیح راستہ اختیار کرنا ہے۔ جب کوئی شخص یہ تینوں مراحل طے کرتا ہے تب اس نے توبہ کی، اور اس کو توبہ کرنا کہتے ہیں۔

غلط کام کرنے کے دوطرح کے اثرات ہوتے ہیں۔ ایک اثر تو معاشرہ پر ہوتا ہے جو جرم کہلاتا ہے اور دوسرا اثر اس غلطی کنندہ کی ذات پر ہوتا ہے جسے گناہ کہا جاتا ہے۔ آپ نے کسی شخص کے ایک ہزار روپے مار لئے۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ کو احساس ندامت ہوا۔

آپ اس کے پاس جائیں۔ اس کی رقم اس کو ادا کریں اس سے معافی مانگیں اور پکا عہد کریں کہ آپ آئندہ کسی کی کوئی رقم نہیں ماریں گے یہ آپ کی توبہ ہوگی۔ یہ توبہ صرف توبہ کا لفظ دہرانے سے نہیں ہوتی۔ نہ توبہ کی تسبیح پڑھنے سے۔

اس جرم کو آئندہ نہ کرنے کی اس توبہ سے آپ کی ذات پر جو بُرا اثر ہوا تھا وہ محو نہیں ہوا۔ اس کے لئے آپ اس شخص سے معافی مانگیں گے، اس کی رقم ادا کریں گے، اس کے بعد آپ دو ہزار روپے کسی اچھے کام پر خرچ کریں گے تو آپ کے اس جرم کا غلط اثر محو جائے گا کیونکہ قرآن کریم نے فرمایا:

اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡهِبۡنَ السَّیِّاٰتِ (11:114)

اعمالِ حسنہ میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ غلط اعمال کے نقصان رساں نتائج کا ازالہ کر دیتے ہیں۔

قرآن کریم میں توبہ کا عمل نہ تو یہودیوں کی طرح ایسا Rigid ہے کہ غلطی کی معافی کا امکان ہی نہ ہو۔ اور نہ ہی عیسائیوں کی طرح ایسا نرم ہے کہ جس میں کسی کام کرنے کی ضرورت نہیں۔

ایک شخص جرم کئے جاتا ہے اگر وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کفارہ پر ایمان لے آئے اور پادری کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہے تو اس کے سب گناہ معاف ہو جائیں گے۔

سورۂ مریم میں ارشادِ عالی ہے:

فَاَمَّا مَنۡ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰۤى اَنۡ يَّكُوۡنَ مِنَ الۡمُفۡلِحِيۡنَ (28:67)

جس نے اس کے بعد اپنی روش بدل لی اور وہ کام کئے جو انسانوں کی صلاحیتوں کو بڑھانے والے ہوں۔

فَعَسٰۤى اَنۡ يَّكُوۡنَ مِنَ الۡمُفۡلِحِيۡنَ (28:67)

اس کی کھیتی پروان چڑھ جائے گی۔

سورۂ مریم میں ارشادِ عالی ہے:

اِلَّا مَنۡ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدۡخُلُوۡنَ الۡجَـنَّةَ (19:60)

فَاَمَّا مَنۡ تَابَ، جو اس چوراہے پر لوٹ آیا۔ وہ اس مقام پر آ گیا جہاں سے اس نے غلط راستہ اختیار کیا تھا پھر عَمِلَ صَالِحًا (19:60) صحیح راستہ پر چل پڑا۔ اس نے دونوں اقدامات اختیار کئے۔ پہلے صحیح راستہ پر آنا۔ پھر اس صحیح راستہ پر چلا، تو وہ جنت میں داخل ہو گیا۔

مذہب میں توبہ، منہ سے توبہ کہنا، یا توبہ کی تسبیح پڑھنا ہوتا ہے۔ دین میں توبہ غلطی کا احساس، احساس کے بعد غلط کام کو چھوڑنا، درست راستہ اختیار کر کے اس پر چلنا ہوتا ہے۔ توبہ کرنا ان تین اقدامات پر مشتمل ہوتا ہے صرف منہ سے توبہ توبہ کہنے سے توبہ نہیں ہو جاتی۔

جامِ مے توبہ شکن، توبہ مِری جام شکن　　سامنے ڈھیر ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا

The Human Self and Allah

Episode No. 7

By G. A. Parwez
(Translated by: Dr. Ejaz Rasool)

This is because everything of the universe is changing and heading towards an end,therefore no entity among these is capable of running the system of the universe permanently on one pattern:

> And call not, besides Allah, on another Ilaah. There is no Ilaah but He. Everything that exists will perish except His own Face.To Him belongs the command, and to Him will you be brought back. (28:88)

There is no power in the world which is such that it is capable of sharing in His sovereignty and power. His is the only Law which is operationalin the universe:

> Or have they an Ilaah, other than Allah? Exalted is Allah far above the things they associate with Him! (52:43)

2.5 Incredulity at the Belief of *Tauheed* (Oneness)

Since the concept of focusing all forces into one Self was based on the reality of anorganised world and mutuallyharmonised universe and thisfact appeared to be a novelthing tothe human mind, when this concept waspresented to them, they therefore expressed extreme astonishment. (And what kind of truth has there been whichknowledge and reasoning presented before man, and to which ignorance and superstition did not object?) They stated with disbelief:

> Has he made the gods (all) into one Ilaah? Truly this is a strange thing! (38:5)

And taking this conceptto be (Allah forbid) a meaningless thing,they would disparage it with mocking laughter:

> For they, when they were told that there is no Ilaah except Allah, would puff themselves up with pride. (37:35)

And would call the one presenting it (Allah forgive) insane:

And say: 'What! Shall we give up our gods for the sake of a poet possessed?' (37:36)

But the Quran took no notice of this rebuff and evasion because it had full certainty that followingthe progression and advance in knowledge and intellect, when the secrets of the universe open up before man, he would be automatically obliged to accept this truth that there can only be the Willof One Beingworkingbehind this system. In order for the universe to function with such equilibrium and discipline,unity of law is indispensable:

Those who adopt, with Allah, another Ilaah: but soon will they come to know (what the truth is). (15:96)

This is why it is a proclamation of the Quran that those people who have conviction in more than one godhave no evidence with them in support of this claim:

Or have they taken for obedienceother Ilaahs besides Him? Say:'Bring your convincing proof'…(21:24)

In this verse *Burhan* (proof, evidence) has been demanded, but as noted in another verse, this is merely a way to state that they do not possess any *Burhan*in any case:

If anyone invokes, besides Allah, any other Ilaah, he has no authority for this…23:117)

Furthermore, ithas also been declared that since the claimants of these beliefs have no logicor evidence, on the discovery and disclosure of the facts they will come to realise in how great an error they were trapped, and the state in which they will find themselvesfrom this humiliating defeat does not requirefurther elucidation.

2.6 Humiliation and Ruin of Man Through*Shirk*

The true reality of *Shirk*only becomes revealed to man when he becomes aware of the worth of his own eminence and personalised self. He comes to know at that momenthow worthless he had made his own selfas a result of making these lowly things as his gods. This is why it is stated:

Take not with Allah another object of obedience; or you (O man!) will sit in disgrace and destitution. (17:22)

In another verse:

…Take not, with Allah, another Ilaah (object of obedience)lest you should be thrown into hell, blameworthy and rejected. (17:39)

In Surah *Shu'ara* it is stated:

So call not on any other Ilaah with Allah,Or you will be among those under the penalty. (26:213)

In Surah *Qaf* it is stated:

...Who set up another Ilaah beside Allah: throw him into a severe penalty. (50:26)

The servants of Allah (*Ibaad-ur-Rehman*)never bow down before anyone else because they are cognisantof the eminence of their self:

Those who invoke not, with Allah, any other Ilaah...(25:68)

2.7 Tyrannical Forces

Among the example of these servants of Allah,the companions of the caveare quoted who had made a resolve to not bow down before anyone other than Allah.[1] How could tyranny tolerate seeing sucha purpose flourish and how could the religious elitebearthis kind of rebellious slogan against their 'gods'? Therefore,it is obvious what kind of dangers and difficulties they would have had to face.Ultimately, the consequence was that they were obliged to leave their settlement and take refuge in a cave[2]:

We provided strength to their hearts: Behold, they stood up and said: 'Our Sustainer is the Rabb of the heavens and of the earth: never shall we call upon any Ilaah other than Him: if we did, we should indeed have uttered an enormity! These our people have taken for obedience Ilaahs other than Him: why do they not bring forward an authority clear (and convincing) for what they do? Who does more wrong than such as invent a falsehood against Allah?' (18:14-15)

And notwithstandingthe era of the companions of the cave, those who wish themselves to be considered as a 'god'have always utilisedtyranny. Pharaoh had said the same to Moses:

He said: 'If you do put forward any Ilaah other than me, I will certainly put you in prison!' (26:29)

And intoxicated by power and authority, he mocked:

Pharaoh said: 'O Chiefs! No Ilaah do I know for you but myself: therefore, O Haman! Light me a kiln out of clay, and build me a lofty palace, that I may mount up to the Ilaah of Moses: but as far as I am concerned I think he is a liar'. (28:38)

---

[1] The narrative of the companions of the cave is detailed in Surah *18, Al-Kahf.* The Quran does not specify the number of companions. (Ed)

[2] For further details see the Urdu book *Shola-e-Mustoor* by the author.

In another verse it is stated:

Pharaoh said: 'O Haman! build me a lofty tower, that I may attain the ways and means of reaching the heavens, and that I may mount up to the Ilaah of Moses: but as far as I am concerned, I think Moses is a liar!' Thus was made alluring in Pharaoh's eyes, the evil of his deeds, and he was hindered from the path; and the plot of Pharaoh led to nothing but perdition (for him). (40:36-37)

But the end that resulted for Pharaoh also portraysto us that whena *Mushrik*[1] makes a claim without presenting proof and evidence,to what extent this is based on truth. When his helplessness became apparent to him then this reality became clearto him that, in truth, there can only be One *Ilaah*:

...At length, when overwhelmed with the flood, he said: 'I believe that there is no Ilaah except Him whom the children of Israel believe in: I am of those who submit (to Allah in Islam). (10:90)

'Pharaoh said, there is no *Ilaah*other than me' – from this the meanings of *Ilaah* becomes clear. The invitation of Moses was that,having freed them from the slavery of Pharaoh, Bani Israel should be settled in anenvironment of freedom where they could purely follow the laws of Allah. The claim of Pharaoh was that in his country obedience and submission could only be to him, therefore Bani Israel could not be given permission to adoptobedience to the laws of someone else. From this it is obvious that *Shirk* is not only that man prostrates before idols made of stones, but a far bigger *Shirk*than thisis that man obeys the man-made laws of menin place of the Divine laws.

2.8 Shirk of Zoroastrians

The Magi (Parsees, who call themselves followersof Zoroaster) believe in two permanent gods – one a god of virtue and one of evil; one a god of light and one a god of darkness. The Quran has repudiated this dogma as well:

Allah has said: 'Take not for obedience two Ilaahs': For He is just One Ilaah: then fear Me (and Me Alone). (16:51)

2.9 Trinity

Christians believe in three gods: Father, Son, Holy Spirit. This dogma is also false:

They do blaspheme (do Kufr)who say: Allah is one of three in a Trinity: for there is no god except One Ilaah...(5:73)

---

[1] *Mushrik* – the one who commits *Shirk*. (Ed)

The Greek belief of Triad which became the Hindu belief based on spirit, matter and God, is also included in this.[1]

2.10 *Ahbaar* and *Ruhbaan* (Religious Scholarsand Priests)

The people of the Book had made priests and religious scholars associates of Allah. Through the path of reverence, shrouded in the veil of human holiness and saintliness,this belief becomes embedded in the mind,and in this manner makesits home in the depths of the heart in such a way that its eradication becomes extremely difficult:

They take their priests and their anchorites to be their sustainers in derogation of Allah, and Christ, the son of Mary; yet they were commanded to follow but one Ilaah: there is no Ilaah but He…(9:31)

These people of the Book were told that making a god out of the *Anbiya* and messengers, priests and religious scholars,is nota teaching from Allah,rather it is the consequence of your owndeliberate concoctions:

…There is no Ilaah except Allah; and Allah is indeed the Exalted in Power, the Wise. (3:62)

2.11 Invisible Faces of *Shirk*

Other than these tangible faces of *Shirk*, the Quran describes such an aspect of *Shirk* which the human eye cannot perceive.Describing this indiscernible thing as *Shirk*is only possible bythat Allah the All Knowing, All Seeing, Who is acquainted with even the thoughts which pass through the depths of the heart. He states:

Do you see such a one who takes for his Ilaah his own passion? Could you be a disposer of his affairs for him? (25:43)

In another verse:

Then see you such a one as takes as his Ilaah his own vain desire? Allah has, knowing (him as such) left him astray, and sealed his hearing and his heart, (and understanding), and put a cover on his sight. Who, then, will guide him after Allah? Will you not then understand? (45:23)

To Be Continued

---

[1] The belief of Hindus is also like that of the Trinity. Believing from ancient times in Brahma (God), *Prakarti* (matter), and *Atma* (spirit/soul), they hold a conviction in 'one in three and three in one'. The famous theologian and philosopher, Ramanuja, was a proponent of this belief and it this very belief which is found in his philosophy.

-4 وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جاسکتا ہے۔

-5 وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

-6 کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کرسکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

-7 وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

-8 مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

-9 ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں' انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

-1 کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

-2 جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہوسکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

-3 جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

-4 جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان وکائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

-5 جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور شستہ بناتی ہو۔

-6 جو ہمیں احکامِ دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو' جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.75
ISSUE
6

Monthly **TOLU-E-ISLAM**

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/talueislam/ www.youtube.com/idaratolueislam

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں